ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلۂ تالیفات

...ہور عہدِ مغلیہ میں

محمد الدین فوق

قیمت ۱۱؍

۱۹۲۷ء

...اول

دیباچہ

سنہ ۱۹۲۳ء و سنہ ۱۹۲۴ء کے شباب اردو (لاہور) اور صوفی (پنڈی بہاؤالد[ین])
میں میرے چند مضامین لاہور کے متعلق چھپتے رہے۔ اس زمانہ میں بعض احباب نے
مضامین کو کتابی صورت میں چھاپنے کا مشورہ دیا۔ اسکے بعد سنہ ۱۹۲۶ء میں رسالہ نیرنگ [خیال]
(لاہور) کے سالانہ نمبر میں جب میرا مضمون "شباب لاہور" کے عنوان سے چھپا۔ تو اکثر خ[طوط]
ایسے آئے کہ یہ ایک مکمل اور جامع مضمون ہے۔ اس کو ضائع نہ ہونا چاہیئے۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ ان تاریخی شکرپاروں کو اپنے اپنے موقع پر "تاریخ لاہور" کے
صفحوں میں جگہ دیدونگا۔ لیکن نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ لاہور جس کا بہت سا بے تر[تیب]
حصہ منتشر طور پر لکھا ہوا موجود بھی ہے۔ کب مکمل ہو۔ اس لئے اس خیال سے کہ یہ
مضامین ضائع نہو جائیں۔ اور ان احباب کی فرمائش بھی پوری ہو جائے۔ جو از راہ [کرم]
میرے ناچیز تاریخی مضامین کو پسند فرماتے ہیں۔ میں نے ان مضامین کو بعنوان "لاہور
عہد مغلیہ میں" کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ لاہور عہد [مغلیہ]
میں کس شباب و عروج پر تھا۔ اس کی مفصل کیفیت میری "تاریخ لاہور" کے [حصہ]
"شباب لاہور" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکیگی۔ جس میں شاہی عمارات و با[غات]
اور شہر کی رونق و آبادی اور لاہور کی پولٹیکل اور علمی زندگی کے علاوہ
زمانہ کے علماء۔ امراء وزراء اور شعراء اور گورنروں کے دلچسپ حالات
ہوں گے۔ اور جس کا حجم انشاءاللہ تین چار سو صفحہ سے کم نہو گا ؛

۱۲ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء
دفتر اخبار کشمیری لاہور

محمد الدین فوق

شباب لاہور

از خامۂ جاں طراز حضرت فوقؔ مدظلہ۔ موٴرخ پنجاب کشمیر

لاہور کی تاریخ جس حد تک حضرت فوقؔ کے قلم کی مرہونِ منت ہے اتنی اور کسی موٴرخ کے قلم کی نہیں۔ یہ موصوف ہی کی بدولت ہے کہ لاہور کے وہ تاریخی مقامات جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکے ہیں ایک دفعہ پھر اپنی گذشتہ عظمت کو لئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لاہور کا کونسا ایسا تاریخی مقام ہے جس کے مٹے ہوئے نشانات اور پریشان ذرات میں جناب فوقؔ کی جان طرازیاں مصروفِ عمل نہ ہوں۔ جناب ممدوح نے کمال نوازش سے اس تاریخ کی پہلی قسط "قوسِ قزح"[1] کو مرحمت فرمائی ہے ——— (کیلانی)

عہدِ بابری

بابر نے ۱۵۲۴ء سے ۱۵۲۶ء تک تین بار لاہور پر حملہ کیا ہے۔ پہلے حملہ میں اس نے برافروختہ ہو کر اپنی فوج کو شہر کے لوٹنے کی اجازت دی۔ فوج نے نہ صرف لوٹ مار ہی کی بلکہ شہر کا کچھ حصہ جلا بھی دیا۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد دولت خاں لودھی حاکم لاہور نے بابر کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ بابر دو مرتبہ آیا۔ اور آخری

[1] منشی محمد وحید صاحب کیلانی ایڈیٹر رسالہ قوس قزح لاہور

مرتبہ تو لاہور اور سرہند سے گذر کر پانی پت پر افغانوں کے ساتھ ایک عظیم جنگ کی جس میں سلطان ابراہیم مارا گیا۔

مغلوں کی سلطنت ہندوستان میں کیا قائم ہوئی۔ کہ دہلی۔ آگرہ وغیرہ مقامات کے ساتھ ہی لاہور کا ستارۂ عروج و اقبال بھی چمک اُٹھا۔ بابر کے جانشینوں کے عہد میں لاہور نے وہ رونق حاصل کی۔ کہ اس کی آبادی اس زمانہ کے مورخین کے قول کے مطابق نو سے بارہ میل کے اندر تھی۔

بابر کے جانشینوں کے زمانہ میں جو کیفیت لاہور کی رہی ہے۔ اس کا مجمل سا بیان یہاں کیا جاتا ہے۔

دَورِ ہمایونی

ہمایوں نے کابل۔ قندھار اور پنجاب اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ کامران کو دیدئیے۔ کامران نے سب سے پہلے لاہور میں خوشنما عمارات کی طرح ڈالی۔ تھارنٹن صاحب کے قول کے مطابق ایک عالیشان محل مع ایک وسیع باغ کے جو نولکھا سے راوی تک پھیلا ہوا تھا۔ تعمیر کرایا۔ اب اس باغ اور محل کا کہیں نشان تک نہیں اس کے علاوہ دریا کے پار ایک اور عالیشان باغ اور خوبصورت بارہ دری کی بنیاد رکھی۔ اسی بارہ دری میں جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو کو سنہ ۱۶۰۶ء مطابق سنہ ۱۰۱۴ھ میں لب دریا ورشہ کے برج میں قید کر دیا تھا۔ اس بارہ دری کا کچھ حصہ اب تک موجود ہے۔ جس کی شکستہ دیواریں دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں۔

کامران مرزا نے اپنے عہد میں لاہور کو بیحد رونق دی۔ جب سنہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کو شکست دی۔ تو وہ اپنے بھائی کے پاس لاہور میں چلا آیا تھا۔

جب شیر شاہ کے خوف سے کامران کابل کو بھاگ گیا اور ہمایوں جو دھپور

اور بلوچستان کے جنگلوں اور ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا ایران کو بھاگا۔ تو شیر شاہ بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اس نے اپنی پنجسالہ حکومت میں رفاہ عام کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ مگر لاہور چونکہ مغلوں کا مرکز تھا۔ اس لئے اسے لاہور سے خاص عداوت تھی۔ اس نے لاہور کو تباہ کر کے اس کی بجائے سیالکوٹ کو پنجاب کا دار الخلافہ مقرر کرنا چاہا۔ مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مرتے وقت اس نے اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے پر دلی افسوس کا اظہار کیا۔[1]

عہدِ اکبری

چودہ (۱۴) سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۵۵۴ء میں ہمایوں ایک فاتح کی حیثیت سے لاہور میں داخل ہوا۔ اہلِ لاہور نے اس کے واپس آنے پر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اور اس شہر میں جسے شیر شاہ اور اس کا بیٹا خاک میں ملانا چاہتے تھے عظیم پیمانہ پر چراغاں کیا گیا۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کے انتقال کے بعد اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانہ میں لاہور کو جو رونق ہر پہلو سے نصیب ہوئی اس کے بعد عہد شاہجہانی کے سوا اور کسی عہد میں نہیں مل سکتی۔ اکبر ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک یعنی کامل پندرہ سال تک لاہور کی آبادی و رونق کے لئے لاہور میں مقیم رہا۔ عہد اکبری کے یوروپین اور ہندوستانی سیاحوں اور مؤرخوں نے لاہور کی نسبت جو لکھا ہے۔ اس کا کچھ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

مسٹر طامسن ہربرٹ نامی ایک سیاح ۱۵۹۵ء میں لاہور آیا۔ اکبر ان دنوں لاہور میں مقیم تھا۔ وہ لکھتا ہے "لاہور کا مقابلہ اگر ہندوستان کے

---

[1] تاریخ پنجاب۔ شیخ محمد لطیف صفحہ ۲۵ +

کسی شہر سے ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف آگرہ ہی ہے۔ اس کی آب و ہوا سال کے ۸ ماہ تک نہایت خوشگوار رہتی ہے۔ بازار اچھے، بارونق اور پختہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے دریائے راوی کے ذریعہ جو شہر کے پاس ہی بہتا ہے صاف کئے جاتے ہیں۔ یہاں کی قابلِ دید عمارات میں سے قلعہ۔ محلات۔ حمام تالاب۔ باغات اور بعض بہترین عمارات ہیں۔ قلعہ بہت بڑا ہے۔ جسے اکبر نے اپنے قیام لاہور کے ایام میں پختہ خشتی بنوایا۔ اور اس میں فلک شگاف عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قلعہ کے بارہ چور دروازے ہیں۔ جن میں سے تین کا منہ شہر کی طرف ہے اور نو کا باہر جنگل کی طرف[1]۔"

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لاہور کے متعلق لکھتا ہے۔ "لاہور بزرگ شہر لیست میانِ دو آبہ باری۔ در بزرگی و انبوہ مردم کم ہمال۔ دریں دولت ابد پیوند قلعہ و ارک او از خشت پختہ ساختہ اند۔ و چوں چند گاہ پایۂ تخت شد و والا کا رہا برافراختہ آمد۔ و دلکشا باغ ہا شادابی دیگر بخشید و گوناگوں مردم بر شہر راہ بیگاہ شد۔ و شگرف کارہا بہر ساختند و در انبوہی و بزرگی از اندازہ گذشت۔"

لاہور میں شالبافی اور پشمینہ کا کام اس کثرت سے ہوتا تھا۔ کہ لاہور اس زمانہ میں چھوٹا کشمیر معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں یہاں کی شالبافی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "و از توجہ شاہنشاہی در لاہور از ہزار کارخانہ زیادہ شدہ"۔

اسی لاہور میں جہاں سولھویں صدی عیسوی میں ایک ہزار سے زیادہ شالبافی کے کارخانے تھے۔ وہاں آج بیسویں صدی میں ایک بھی نہیں ہے۔

لاہور ہی سے اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا۔ اور اسی شہر میں بیٹھ کر اقوام سرحد

---

[1] آج کل صرف ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔ جو ڈیرہ گوروارجن دیو اور سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل ہے ۔

کی گوشمالی کی۔ اسی شہر میں اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے خیرپورہ[1] اور دھرم پورہ کے نام سے دو عظیم الشان غریب خانے (POOR HOUSES) قائم کئے۔ اسی شہر میں اکبر نے ملّا احمد ٹھٹھوی کو تاریخ الفی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کو رامائن۔ جامع رشیدی اور مہابھارت کے تراجم اور ملّا محمد شاہ آبادی کاشمیری کو تاریخ کشمیر لکھنے کا حکم دیا۔ اسی شہر میں فیضی نے ۱۰۰۳ھ میں نل دمن کی مثنوی لکھی ۔

۱۵۹۵ء میں اکبر لاہور ہی میں تھا کہ گوا سے پرتگیزی پادریوں کی ایک جماعت اس کے پاس آئی۔ ان پادریوں نے اپنے دلچسپ سفرناموں میں لاہور کی بہت تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ شہر ایسا بارونق اور آباد ہے۔ اور اس میں شاہی محلات کے علاوہ امراء و وزراء کے ایسے ایسے عالیشان مکانات ہیں کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادشاہ ان ایام میں راوی کے ایک جزیرہ میں رہتا تھا۔ جہاں اس کے رہنے کے لئے ایک خوشنما بنگلہ بنایا گیا تھا[2]

لاہور میں اکبر نے سب سے پہلے سکھوں کے چوتھے گورو رامداس کی شہرت سُنی۔ اور ان سے ملاقات کی اور خوش ہو کر پانچ سو بیگھہ اراضی ان کو مرحمت کی۔ جہاں گرو صاحب نے امرت سر کی بنیاد ڈالی ۔

لاہور میں اکبر نے اپنے نام پر ایک منڈی بھی تعمیر کی۔ جسے آج تک اکبری منڈی کے نام سے پکارتے ہیں۔ نیز ایک دروازہ بنایا جس کا نام اس کے نام پر اکبری دروازہ رکھا گیا۔ ان دونوں عمارتوں کی موجودہ شکل بہت

[1] خیرپورہ کی عمارت کا کچھ حصّہ اب بھی داراشکوہ کے قریب سڑک میانمیرؒ کی بائیں جانب موجود ہے ۔

[2] آج کل اس جزیرہ اور بنگلہ کا نشان تک نہیں ہے ۔

تبدیل ہو چکی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہے۔ کہ صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ عمارتوں کی وضع قطع اکبری عہد کی سی نہیں ہے۔

ابو الفضل نے لاہور میں ایک عظیم الشان مکان "فضل آباد" کے نام سے تعمیر کیا۔ اسی جگہ ابو الفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک نے ۱۰۰۱ھ میں انتقال کیا۔

ہمایوں کے زمانہ کے ایک بزرگ جنہوں نے سوری خاندان کے زمانہ میں بڑا عروج پایا تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی پورے عروج پر تھے نام ملّا عبد اللہ اور خطاب مخدوم الملک تھا۔ ان کے املاک اور مکانات جو شاہی ایوانات سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ لاہور میں تھے۔ ملائے مذکور نے ان مکانات کے اندر بڑی بڑی قبریں بنوا رکھی تھیں۔ جن پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے۔ اور دن ہی سے چراغ جلنے لگتے تھے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی کہ یہ مقبرے اور مزار نہیں بلکہ دفینے اور خزانے ہیں۔ جب ان قبروں کو کھدوا گیا۔ تو اس قدر زر و دولت برآمد ہوا کہ بادشاہ دنگ رہ گیا۔ یہ سب مال تین کروڑ روپے کا تھا۔ جو اینٹوں کی شکل میں صندوقوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ آخر یہ سب مال جو خلقِ خدا کے گلے گھونٹ گھونٹ کر جمع کیا گیا تھا۔ اکبری خزانہ میں داخل کر لیا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوانداس کے محلات دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے تھے۔ مگر اب ان کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

اکبر کے اتالیق بیرم خاں کا بیٹا عبد الرحیم خانخاناں جس کی فیاضی و سخاوت نے حاتم کو بھی مات کر دیا تھا۔ لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کے باپ کا رفیع الشان محل لاہور کے لئے باعثِ نازش تھا۔

حکیم ہمام کے بھائی حکیم علی گیلانی کا حوض[۱] اسی لاہور میں تھا۔ جسے

[۱] بحوالہ مآثر الامراء تاریخ لاہور (انگریزی و اردو) دربار اکبری۔ تاریخ ذکاء اللہ۔

اس قابل حکیم نے سنہ ۱۰۰۴ھ میں اس حکمت کے ساتھ تعمیر کیا۔ کہ بڑے بڑے انجینئر حیران رہ گئے۔ اس حوض میں یہ خوبی تھی۔ کہ اس کی تہ تک ایک زینہ کے ذریعے جانا پڑتا تھا۔ اور وہ زینہ ایک ایسے حجرے یا کمرے میں جاکر ختم ہوتا تھا۔ جو حوض کی تہ کے نیچے واقع تھا۔ یہ حجرہ رقبہ میں ۳۶ مربع گز تھا اور سنگین حوض کی تہ کے عین وسط میں واقع تھا۔ اس کی چھت پر ایک بلند منارہ اور حجرہ کے چاروں طرف چار پل تھے۔ حجرے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے لیکن پانی اندر نہیں جاسکتا تھا۔

اکبر عجائبات کا عاشق تھا۔ اس نے بہ نفس نفیس اس حوض کو ملاحظہ فرمایا کپڑے اوتار کر غوطہ لگایا اور حجرہ میں داخل ہوگیا۔ اس حجرہ میں ایک تکیہ اور چند کتابیں مطالعہ کے لئے رکھی تھیں۔ حجرہ میں ہوا اور روشنی کا پورا انتظام تھا۔ بادشاہ کو مختصر سی حاضری بھی دی گئی۔ جسے اُس نے نہایت شوق سے نوش فرمایا ہوا خواہ باہر تھے۔ وہ بہت گھبرائے۔ جب بادشاہ باہر آیا تو سب کو اطمینان ہُوا بادشاہ نے اور خوش ہوکر حکیم موصوف کو منصب پنجصدی عطا کیا۔

جہانگیر نے بھی اس حوض کا اپنی تزک میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔ "حجرہ نہایت روشن ہے جس کا راستہ اسی حوض میں سے ہے۔ مگر پانی کی ایک بوند اندر نہیں جاتی۔ دس بارہ آدمی حجرہ میں بآسانی بیٹھ سکتے ہیں" (ترجمہ)

جہانگیر نے حکیم علی گیلانی کو منصب دوہزاری اور اس کے بیٹے حکیم عبدالوہاب کو پانصد سوار کا منصب عطا کیا۔ سنہ ۱۰۱۹ھ میں اسی نمونہ پر ایک اور حکیم نے فتحپور سیکری میں ایک حوض بنانا چاہا۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔

اکبر کے زمانہ میں دریائے راوی نہایت جوش و خروش سے بہتا تھا۔ ان دنوں اس کا پانی اس قدر گہرا تھا۔ کہ اس میں جہاز چلا کرتے تھے (ترجمہ)

سنہ ۱۰۰۲ھ میں راوی کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز اونچی کا مستول تھا۔ ۲۹۳۶ شہتیر سال اور ناجو کے استعمال کئے گئے۔ اور ۶۸۴ من دو سیر لوہا خرچ ہوا۔ ۲۴۰ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس پر کام کرتے رہے۔ تیار ہو جانے پر ایک ہزار آدمیوں نے ۱۰ روز میں بڑی مشکل سے اسے دریا میں ڈالا۔ اور لاہری بندر (موجودہ روہڑی جو سکھر کے متصل دریائے سندھ پر واقع ہے) پہنچایا۔ جہاز وزنی تھا۔ اور دریا میں پانی کم تھا۔ اس لئے جہاز کو جا بجا رُکنا پڑا۔ آخر بعد مشکل جہاز منزل مقصود پر پہنچا۔ اس زمانہ میں ایسے ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے۔ جو دریا کا زور بڑھا کر گذرگاہ کو جہاز رانی کے قابل بنا لیتے۔ اس لئے آمد و رفت جاری نہ رہ سکی شہنشاہ نے سنہ ۱۰۰۲ھ میں ایک اور جہاز تیار کرایا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھ کر جہاز کے وزن کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی یہ جہاز ۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک بآسانی جا پہنچا۔ اس کا مستول ۳۷ گز کا تھا اور ۱۶۲۳۸ روپے اس پر لاگت آئی تھی۱؎

زندہ دل بادشاہ نے جہاں جہاز چلا دئے وہاں کشتیوں کا کیا شمار ہوگا! اور پھر جب امراء و وزراء اور خود شہنشاہ کشتیوں کی سیر کرتے ہونگے اور عام لوگ بھی اپنی یا کرایہ کی کشتیوں میں دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے سیر ہوتے ہونگے۔ تو وہ وقت کیا فرحت افزا ہوتا ہوگا۔

سنہ ۹۹۹ھ کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھ (سندھ) پر یورش کی۔ سامانِ جنگ خشکی کے راستہ کے علاوہ راوی کے ذریعہ ٹھٹھ کو بھیجا گیا۔ دربار اکبری میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے اس مہم میں ایک لاکھ روپیہ ایک مرتبہ بھی اس

۱؎ دربار اکبری۔ بحوالہ اکبر نامہ صفحہ ۱۱۲ +

ہزار ایک دفعہ۔ پھر لاکھ روپیہ اور ایک لاکھ من غلّہ۔ سو بڑی توپیں اور دیگر سامان جنگ راوی کے ذریعہ ٹھٹھہ کو بھیجا۔ جہاں مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ سے کئی دن تک بحری جنگ ہوتی رہی۔ خانخانان مرزا عبدالرحیم اس مہم کا سپہ سالار تھا اور علاوہ دیگر کشتیوں کے کل ۲۵ جنگی کشتیاں لیکر لاہور سے وہ چلا تھا۔ اور سنہ ۱۰۰۱ھ کے جشن نوروزی میں مرزا جانی کو گرفتار کرکے لاہور لے آیا"۔

اکبر کے زمانہ میں لاہور کو وہ عروج حاصل ہوا۔ کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہنشاہ جو عجیب غریب طبیعت لیکر آیا تھا۔ جر ثقیل اور طبعیات کے عمل کرتا۔ علم ہیئت کے آلات رکھتا۔ علم کیمیا کے شعبدے دیکھتا اور خود دکھاتا آگرہ کی طرح لاہور میں بھی آتشکدے تعمیر کرائے۔ نوروز کی صبح کو کھلے بندوں سورج کی پرستش کرتا۔ برہمن اپنے مذہبی تہواروں میں اس کی پیشانی پر ٹیکہ لگاتے تھے۔ علمی جلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ بڑے بڑے علماء و فضلاء اور پنڈتوں کے مباحثے گرم کراتا تھا۔

اکبر کے طویل قیام کی وجہ سے لاہور کے باہر ایک اور لاہور تیار ہو رہا تھا۔ جسے بیرون شہر کی آبادی (CIVIL STATION) کہتے تھے۔ شاہجہان کے زمانہ تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں لاہور "شکار گاہ" بھی رہا ہے۔ سنہ ۹۹۴ھ کا ذکر ہے۔ کہ اکبر نے اپنے سوتیلے بھائی حکیم مرزا کی بغاوت فرو کرنے کے بعد لاہور میں قیام کیا۔ اور ایران و توران کے بادشاہوں کے طریق پر "شکار قرغہ" یا جرگہ کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر چالیس کوس کے دورے سے قراول اور شکاری جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے پانچ کوس پر شکار کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور نیک شگون نظر آئے۔ اس زمانہ میں لاہور کے ارد گرد بے شمار جنگل تھے۔ جو ایک طرف

قصور۔ شرقپور اور شیخوپورہ اور دوسری طرف امرت سر تک پھیلے ہوئے تھے۔

عہدِ جہانگیری

اکبر کے بعد ۱۶۰۵ء میں جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لاہور جہانگیری عہد میں بھی ہندوستان کے کسی شہر سے کم نہیں تھا۔ ۱۶۲۶ء میں دو انگریزوں نے لاہور کو دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"لاہور ہندوستان میں چوٹی کا شہر ہے۔ ہر چیز یہاں بافراط مل سکتی ہے حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار اور ایسا آباد قطعۂ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور ٹھٹھہ کے لئے سوداگر لوگ جہازوں میں اپنا مال لاتے ہیں۔ اور دریا کے کنارہ پر ایک عجیب رونق رہتی ہے۔ ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے ہیں۔"

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا! اور کیا لوگ تھے!! راوی اور جہاز! یہ دونوں باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں پھر خشکی کی تجارت اور بارہ چودہ ہزار لدے ہوئے اونٹوں کی ہر سال ایران کو روانگی! کیا آج بھی جبکہ تہذیب و آسائش اپنی انتہائی منزل پر پہنچ چکی ہے۔ یہ باتیں نظر آتی ہیں؟

جہانگیر کی تخت نشینی کے چھٹے ہی مہینے میں اہل لاہور کو ایک عجیب و دردناک واقعہ دیکھنا پڑا۔ جہانگیر کی اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو سے ہمیشہ اَن بَن رہتی تھی۔ باپ کی تخت نشینی کے بعد چار ماہ تک تو خسرو خاموش رہا۔ مگر پھر دفعتہً آگرہ کے قلعہ سے نکل بھاگا۔ اور دس ہزار سواروں کی معیت میں

دہلی اور متھرا کو تاراج کرتا ہوا لاہور آ پہنچا۔ آتے ہی حکم دیا۔ کہ قلعہ کو فتح کر کے سات روز تک شہر کو بیدریغ لوٹو۔ بچہ۔ جوان۔ بوڑھا عورت جو ملے اُسے قتل کر دو اور شہر کو آگ لگا دو! فوج ایک دروازہ کو جلا کر شہر میں ابھی داخل ہی ہوئی تھی کہ جہانگیر بھی ایک کثیر فوج کے ساتھ آ پہنچا۔ خسرو نے مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھا کر کابل کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن راستہ میں سودھرہ (متصل وزیرآباد) کے قریب گرفتار ہو کر واپس لایا گیا۔ جہانگیر اس وقت مرزا کامران کی بارہ دری میں جو راوی کے کنارہ پر واقع ہے۔ مقیم تھا۔ اس وقت خسرو کے ہمراہ سات سو آدمی تھے۔ جن میں حسن بیگ بدخشانی اس کا سپہ سالار اور عبدالرحیم دیوان لاہور بھی شامل تھے۔ جہانگیر نے بارہ دری سے قلعہ لاہور تک دو طرفہ لکڑی کی پھانسیاں گڑوائیں۔ اور ان سات سو قیدیوں کو یکدم پھانسی دیدیا۔ خسرو کو پا بہ زنجیر ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا۔ اور جس راستے اُس کے سات سو ہمراہی سخت اذیتوں سے مارے جا رہے تھے۔ اسی راستے اُسے قلعہ میں بھجوایا گیا۔ تا کہ وہ اپنے باغی ہمراہیوں کا انجام دیکھ لے۔ اس کے علاوہ اس کے سپہ سالار حسین بیگ کو گائے کی کھال میں اور عبدالرحیم دیوان کو گدھے کی کھال میں زندہ بند کرا دیا۔ اور یہ دونوں دم گھُٹ کر مر گئے۔ خسرو اس کے بعد پانچ سال تک قید رہا۔ آخر سنہ ۱۶۲۱ء میں نہایت ذلت و رسوائی میں مر گیا۔ لاہور کے لوگوں پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی دن میں سات سو آدمیوں کا پھانسی پانا ایک نہایت ہی دل ہلا دینے والا واقعہ ہے!

اکبر یورپین پادریوں کی بیحد عزت کرتا تھا۔ لیکن جہانگیر اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ اس نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلے ایک گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ان کے لئے خزانہ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر کئے

کر دیئے۔ شاہجہان نے جو اکبر اور جہانگیر کی نسبت شریعت کا زیادہ پابند تھا تخت پر بیٹھتے ہی اس گرجا کو مسمار کرا دیا۔ اور پادریوں کے وظائف ضبط کر لئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۶۶۵ء میں) ایک فرانسیسی سیاح تھیونات لاہور آیا۔ اس وقت تک اس گرجا کے آثار باقی تھے لیکن اب معدوم ہو چکے ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں لاہور میں گرو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کا ایک قابلِ ذکر واقعہ گذرا۔ گرو ارجن دیو اور دیوان چندو لال کی آپس میں عداوت تھی دیوان نے گرو کے خلاف گورنر لاہور کے کان بھرے اور کہا۔ کہ گرو کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو یوں آزاد رکھنا خلافِ مصلحت ہے۔ گرو ارجن دیو قید کر لئے گئے۔ اور وہ قید ہی میں انتقال کر گئے۔ جب ان کا بیٹا گرو ہرگوبند جوان ہوا۔ تو اس نے دیوان کے خلاف بادشاہ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ دیوان گرو ہرگوبند کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور ہرگوبند نے اسے قتل کر کے باپ کا انتقام لیا +

جہانگیر نے قلعہ میں بہت سی عالیشان عمارتوں کا اضافہ کیا۔ اور اس کے امراء و وزراء نے کئی بے نظیر عمارات لاہور شہر میں بنائیں۔ اور ان کے گرد وسیع باغات لگوائے۔

جہانگیر کو باپ کی طرح لاہور سے کمال انس تھا۔ اور ۱۶۲۲ء میں تو اس نے لاہور کو دارالسلطنت ہی بنا لیا۔ اور ۱۶۲۷ء میں جب اس نے سفر کشمیر کے دوران میں راجوری کے قریب وفات پائی۔ تو لاہور ہی میں دفن کئے جانے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ اپنی چہیتی بیگم نورجہاں کے باغ دلکشا میں دفن کر دیا گیا۔ اس کا عظیم الشان مقبرہ دریائے راوی کے دائیں کنارے پر قصبہ شاہدرہ کے پاس واقع ہے۔ اور عجائبات زمانہ میں شمار ہوتا ہے +

عہدِ شاہجہانی

جہانگیر کے انتقال کے وقت نور جہاں کا داماد اور جہانگیر کا بیٹا شہریار لاہور ہی میں موجود تھا۔ اس نے سات دن میں سات لاکھ روپیہ خرچ کر کے بیفکروں کی ایک فوج جمع کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ شاہجہان جو نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا داماد تھا اس وقت دکن میں تھا۔ وہ آصف جاہ کے اشارے سے پر لگا کر آگرہ میں پہنچا۔ ادھر آصف جاہ یہ چال چلا کہ خسرو مرحوم کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو زندان خانہ سے نکال کر شہریار کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اور سلطنت کی مبارکباد دی۔ داور بخش سمجھ گیا۔ کہ نور جہاں اپنے داماد اور آصفجاہ اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہیں۔ اور میں محض گوسفند قربانی ہوں۔ اس نے آصف جاہ کا شکریہ ادا کر کے تخت و تاج سے انکار کر دیا۔ لیکن آصفجاہ نے اس قدر قسمیں کھائیں اور ایسا یقین دلایا۔ کہ وہ اجل گرفتہ شہزادہ آخرکار رضامند ہو گیا۔ وہ شہریار سے لڑا اور شہریار کو شکست ہو گئی۔ آصف جاہ اور داور بخش فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے قلعہ میں داخل ہوئے۔ اور آصف جاہ نے شہریار کی آنکھیں نکلوا دیں اس موقعہ پر بدنصیب شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی

ز نرگس گلاب ار چہ خواں کشید ــــ کشیدند از نرگسِ من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من ــــ بگو کور شد دیدۂ آفتاب

شاہجہان نے آگرہ پہنچ کر آصف جاہ کو کہلوا بھیجا۔ کہ لاہور میں جسقدر شہزادے موجود ہیں سب کو ٹھکانے لگا دو۔ چنانچہ ۲ ربیع الآخر ۱۰۳۷ھ بروز ہفتہ آصف جاہ نے داور بخش کو تخت سے اتار کر قید کر دیا۔ اور شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا۔ داور بخش نے آصف جاہ کو اس کے قول و قسم یاد دلائے مگر وہاں

کون سُنتا تھا۔ آخر جمادی الاوّلی کو مندرجہ ذیل شہزادے ایک ہی وقت میں تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے:۔

(۱) شہزادہ داور بخش (۲) اس کا بھائی گرشاسپ (۳) شہریار داماد نور جہاں (۴) طہورث اور (۵) طہماسپ (پسران سلطان دانیال پسر اکبر

شاہجہان نے بادشاہ ہوکر اپنے باپ جہانگیر کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا (جسکا ذکر پہلے آچکا ہے) جو سالہا سال گذر جانے اور سکھوں کے زمانہ کی دستبرد کے بعد بھی ہندوستان کی لاجواب عمارتوں میں شمار ہوتا ہے نورجہاں نے بھی ۱۶۴۶ء میں اسی کے عہد حکومت میں وفات پائی جس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں روضۂ جہانگیر کے نمونہ پر " چارچمن " کے اندر تعمیر کرایا تھا۔

آصف جاہ نے بھی جس کی کوششوں سے شاہجہان کو تخت ہند نصیب ہوا۔ اسی کے عہد حکومت میں ۱۶۴۱ء میں وفات پائی۔ آصف جاہ کو آصف خاں یمین الدولہ " بھی کہتے ہیں۔ مآثر الامراء میں اس کے بہت سے حالات درج ہیں۔ بہت ہی بسیار خور تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ " ایک من شاہجہانی وزن دن رات میں کھاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ اور اس کے چاروں طرف ایک خوش وضع باغ بھی لگایا۔ یہ مقبرہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں اب بھی موجود ہے۔

لاہور میں جہاں آج کل لنڈا بازار میں میاں سلطان کی سرائے اور اس کا ٹھنڈا کنواں اور باغ موجود ہے۔ آصف جاہ کی عالیشان حویلی آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ عہد عالمگیری کے مؤرخ منشی سبحان رائے بٹالوی نے اس حویلی کے متعلق لکھا ہے :۔

" از عمارات منازل بادشاہزادگان و امرائے والا شان خصوص عمارت

(صفحہ ۶۵)

آصف خاں عرف امیر الحسن بن اعتماد الدولہ از دیاد آبادی گردید ۔ خلاصۃ التواریخ مآثر الامراء اور ظفر نامہ شاہجہان میں لکھا ہے ۔ کہ اس حویلی پر بیس[۲] لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی ! حویلی کیا تھی ۔ ایک خاصا قلعہ تھا ۔ وطن بلڈنگ کے عقب سے لے کر شہید گنج ۔ سرائے میاں سلطان اور ریلوے ٹیکنیکل سکول تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کے اندر حمام ۔ مسجدیں ۔ دفاتر ۔ تالاب ۔ حوض ۔ فوارے ۔ باغ اور زنانہ مردانہ محلات تھے ۔ شاہجہان اس میں کئی مرتبہ آیا تھا ۔ دہلی ۔ آگرہ اور کشمیر میں آصف جاہ کی جائداد کا جائزہ لیا گیا ۔ تو اڑھائی کروڑ روپیہ تک درج رجسٹر ہوا ۔ بادشاہ نے اس کے انتقال کے بعد ۲۰ لاکھ روپیہ اس کے تین بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا ۔ اور حویلی شہزادہ داراشکوہ کو مرحمت فرمائی ۔ باقی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کی گئی ۔

جہانگیر نے قلعۂ لاہور میں کچھ عمارتیں تعمیر کرائی تھیں ۔ لیکن شاہجہان کو پسند نہ آئیں ۔ اس لئے نواب وزیر خاں بانیٔ مسجد وزیر خاں کو حکم ہوا ۔ کہ سب عمارات از سر نو تعمیر کرائی جائیں ۔ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان پھر آگرہ سے لاہور میں آیا ۔ علی مردان خاں قندھاری بادشاہ کے حضور میں آیا ۔ شاہجہان نے اسے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور ایک خلعت فاخرہ انعام دے کر کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا ۔ علامی افضل وزیر سلطنت تھے ۔

شاہجہان ۱۶۳۹ء میں پھر لاہور آیا ۔ علی مردان خاں اور داراشکوہ پیشوائی کے لئے موجود تھے ۔ علی مردان خاں نے اہل ایران کے طور و طریق پر شب برات کی روشنی کا تماشا بادشاہ کو دکھایا ۔ مختلف شکلوں کے تختوں اور چھتوں پر طاق بندی کی ۔ اہل لاہور نے اس قسم کی کیفیت پہلے نہیں دیکھی تھی ۔ اسی شب بادشاہ نے دس ہزار روپیہ غرباء میں تقسیم کیا ۔ اور اسی رات علامہ عبد الحکیم

[۲] مولوی محمد انشاء اللہ خاں آنریری مجسٹریٹ و مالک و ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے مکان کا نام ہے ۔

سیالکوٹی اور ملا فاضل کو چار چار سو اشرفی انعام میں دی گئی ہے۔[۱]

لاہور میں شاہجہان کی سب سے بڑی یادگار شالامار باغ ہے۔ جو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ اور پانچ یوم میں چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا۔

شاہجہان کے عہد حکومت میں بھی کئی فرنگستانی سیر و سیاحت اور تبلیغ عیسائیت کی غرض سے ہندوستان میں آتے رہے۔ ۱۶۴۱ء میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں لاہور کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

(ترجمہ) "آگرہ سے روانہ ہوئے ہمیں اکیسواں دن تھا۔ کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا۔ جس میں آبادی اس قدر تھی۔ کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں (اب یہ گنبد موجود نہیں ہیں۔ فوق) شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ پیادہ چل رہے تھے۔ کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں غرض کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس لئے ہم واپس آ گئے۔ شہر کے دروازہ کے باہر بہت سے درخت تھے۔ جہاں نانبائی اور مختلف دوکاندار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے۔ پھر ہم نے بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ۔ بکری گائے وغیرہ کے گوشت کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی مل سکتا تھا۔ البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دوکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے۔ ہر قسم کی سبزی اور میوہ بافراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو

[۱] تاریخ محمد شاہی قلمی مصنفہ خوشحال چند ساہی۔

لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہے۔ ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں (یعنی تنوروں میں۔ تونْ) ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے۔ جو میدہ سے بنائی جاتی ہے۔ ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے۔ ایک آدمی اعلےٰ سے اعلےٰ قسم کا کھانا دو وقتوں میں پانچ آنہ تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی افراط اور ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور خوش سلیقگی سے ہم بجد متاثر ہوئے۔ خصوصاً اس بات سے کہ سکون و اطمینان اور امن و امان ہر شخص کے چہرے بلکہ درو دیوار سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اور سوداگر لوگ نہایت آزادی اور بے فکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔

لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے۔ جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے۔ اور وہاں سے سندھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجے کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغات۔ محلات۔ تالاب اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بڑے بازار کا نام "بازار دلکشا" ہے۔ اس میں اس قدر دولت ہے۔ کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے[1]"

شاہجہان کے زمانہ میں جو ترقی لاہور کو ہوئی۔ وہ اکبر کے زمانہ سے بھی زیادہ تھی۔ لاہور کے باہر دُور دُور تک نئے محلے آباد ہو رہے تھے۔ اور باغات و محلات کی کثرت نے لاہور کو گلزار ارم بنا رکھا تھا۔ نواب علیم الدین الملقب بہ وزیر خاں نے اپنی عالیشان مسجد شہر کے اندر بنائی جو اب تک لاہور کی زینت کا باعث ہے نواب وزیر خاں کا باغ۔ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کا فلک نما مکان جو آج

[1] "بازار دلکشا" معلوم نہیں کس جگہ واقع تھا۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خوب کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہوگا۔

"رنگ محل" میں "حویلی میاں خاں" کے نام سے موسوم ہے۔ نواب وزیر خاں کا مکان "پری محل" جس کے کھنڈرات اب بھی شاہ عالمی دروازہ کے اندر نظر آتے ہیں دائی لاڈو کے آسمان مرتبت ایوانات جو باغ مہاں سنگھ اور باغ رتن چند داڑھی والا" کے آس پاس تھے۔ اور جہاں اب بھی دائی لاڈو کی مسجد موجود ہے۔ پھر محلہ "دائی انگہ" جو ریلوے سٹیشن کے پاس تھا۔ اور جہاں اب بھی مسجد دائی انگہ موجود ہے مقبرہ بُدھو کی نواب علی مردان خاں جنہیں محکمہ ریلوے نے اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کے بیسیوں محلے لاہور کی زیبائش و شہرت کا باعث تھے۔

یہ شرف لاہور ہی کو حاصل ہے۔ کہ نواب سعد اللہ خاں (وزیر شاہجہان) نے اپنی ابتدائی زندگی حصول علم میں اسی جگہ گذاری۔ اور پھر جب بادشاہ کو اس کی قابلیت کا علم ہوا۔ تو لاہور میں اسے شرف باریابی بخشا۔ اور چار ہی سال کے اندر اس کو تمام ہندوستان کا مدار المہام بنا دیا۔ اور پھر جب سعد اللہ خاں نے وفات پائی۔ تو اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کو اعلیٰ منصب عطا کیا اور اس کے دوسرے بیٹوں اور متوسلین کے روزینے مقرر کر دیئے۔

دارا شکوہ چونکہ صوفی منش شہزادہ اور سلطنت کا ولیعہد تھا۔ اسلئے پنجاب کے لوگ اور خصوصاً اہلیان لاہور اس کے نہایت گرویدہ تھے۔ شہزادہ بھی ان سے بہت مانوس تھا۔ اس لئے کئی عالیشان محلات تعمیر کرائے۔ اور ایک پُر فضا چوک اپنے نام سے اس جگہ قائم کیا جہاں لنڈا بازار میں آج کل مسجد "شہید گنج" واقع ہے۔ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ جس کی ایک کچی دیوار ریلوے ٹیکنیکل سکول کی تعمیر کے زمانہ میں مسمار کر دی گئی تھی۔

دارا شکوہ کے دم سے لاہور میں بڑی رونق تھی۔ جس طرح وہ اسلامی

تصوف کا دلدادہ تھا۔ اسی ذوق شوق سے ویدانت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجلس میں ایک طرف صوفیاء بیٹھے تھے اور دوسری طرف پنڈت اور جوگی۔ اکبر کی طرح مسلمان علماء اور ہندو پنڈتوں کے مباحثے کراتا۔ اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کراتا تھا +

داراشکوہ اور گورو ہرگوبند میں بہت موانست تھی۔ جب گوروجی امرتسر سے آتے۔ تو مہینوں داراشکوہ کے مہمان رہتے۔ اور مسائل تصوف کے ذکر اذکار سے صحبت گرم رکھتے +

عہدِ عالمگیری

اگرچہ باپ کو نظر بند کر کے عالمگیر (اورنگ زیب) ۱۶۵۸ء میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ لیکن جب تک بھائی موجود تھے۔ خصوصاً داراشکوہ جو ولیعہد تھا۔ اس وقت تک اسے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے سب سے پہلے پنجاب کا رُخ کیا جو داراشکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ داراشکوہ جہاں کہیں بھی ہوگا بھاگ کر آخر لاہور ہی میں جائیگا اور وہاں سے تیار ہو کر مقابلہ کو نکلیگا۔ چنانچہ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ داراشکوہ بھاگ کر پہلے شالامار باغ میں پہنچا۔ اور وہاں سے زمین دوز سرنگ کے ذریعے قلعہ میں پہنچا اور اپنا خزانہ جو ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا تھا ہمراہ لے کر ملتان کے رستے بھکر اور سندھ کو چلا گیا۔ تقریباً چودہ ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ اور توپخانہ اور کارخانجات شاہی یہ سب اس کے علاوہ تھے۔ بڑی بڑی کشتیوں میں یہ سب اسباب لدوا کر راوی میں ڈالا۔ اور وہاں سے ملتان پہنچا۔ اس کے جانیکے بعد شہزادہ اعظم شاہ (اورنگ زیب کا بیٹا)

ایک زبردست فوج لیکر لاہور پہنچا۔ مگر خیریت گذری کہ لاہور والوں کو کوئی تکلیف نہ دیگئی۔ اِس سے چند ماہ بعد اورنگ بھی لاہور پہنچا۔ اور شالامار باغ کے پہلے تختے میں قیام پذیر ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر لاہور میں داخل ہوا۔ قلعہ کی سیر کی۔ اور واپسی پر مسجد وزیر خاں میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر باغ میں چلا گیا۔ مہمات پنجاب کا کام شہزادہ اعظم اور قلعہ دار اور خلیل اللہ خاں گورنر لاہور کو سپرد کر کے خود شجاع کے استیصال کے لئے واپس چلا گیا۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کی سیاسی لحاظ سے کوئی اہمیت نہ رہی۔ وہ صرف دو مرتبہ لاہور میں آیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ دکن اور راجپوتانہ کی لڑائیوں ہی میں گذر گیا۔ حالات و واقعات نے اسے اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ لاہور کی افزائش کی طرف متوجہ ہوتا۔

لاہور میں عہد عالمگیر کی تین یادگاریں ہیں۔ جن میں سے دو تو مٹ گئی ہیں لیکن ایک موجود ہے۔ اور انشاء اللہ تا قیامت موجود رہیگی ان یادگاروں کا تھوڑا تھوڑا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۶۶۳ء میں عالمگیر لاہور میں تھا۔ کہ اس کے قابل اور دانا وزیر فاضل خاں نے ۲۷ ذیقعدہ کو ستر سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔ اس نے اپنا عالیشان مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تیار کرا لیا تھا۔ بادشاہ کے حکم سے وہیں دفن کیا گیا۔ بادشاہ اس موقعہ پر کوئی جشن کرنے کو تھا۔ لیکن وزیر کی موت پر اس نے وہ جشن ملتوی کر دیا۔ خدا جانے کس قدر عظیم الشان مقبرہ تھا۔ مگر اب معلوم بھی نہیں کہ وہ کہاں واقع تھا۔

دوسری یادگار ایک بند تھا۔ جو عالمگیر نے ۱۶۶۲ء میں لاہور کو راوی کی دستبرد سے بچانے کے لئے باندھا تھا۔ اس بند کا ذکر لاہور کی اُردو انگریزی

تاریخوں میں کہیں کہیں نظر سے گذرتا ہے۔ لیکن خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سبحان رائے بٹالوی میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"در عہد حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی چوں دریائے راوی بجانب شہر رُو نہاد۔ وازصدمات آں بہ اکثر عمارات و باغات آسیب رسید درسنہ چہارم جلوس والا برائے تعمیر بند مستحکم کہ سدِ انہدام عمارات تواند بود حکم مقدس بصدور پیوست۔ فرمان پذیراں بند بہ درازئے دو کروہ بہ استحکام تمام بستند۔ و بہ محافظت شہر سدِ عالمگیری بسانِ سدِ سکندری بروئے کار آوردند۔ و در اکثر جا مانند تالاب زینہ آراستہ لب دریا را بہ مثالِ لبِ خوبانِ تفریب ساختند۔ و خوانینِ والا شان نشیمن ہائے دلکشا و منازل فرح افزا مشرف بہ دریا احداث نمودہ زینت افزائے شہر شدند۔ و از ابتدائے سال چہارم نہایت حال کہ زیادہ از چہل مے گذرد۔ و در ہر سال ترمیم و تعمیر از سرکار بادشاہی میشود و برائے بندوبست مبلغ کلیہ بہ خرچ مے رود"

اس رُوح افزا کیفیت کو ذرا ذہن میں لایئے۔ جبکہ بندِ عالمگیری مکمل ہو چکا تھا۔ اور اس کے کناروں پر تالاب کی سیڑھیوں کی طرح نہانے اور سیر و تفریح کے لئے سیڑھیاں موجود تھیں۔ اور امرائے والا شان نے وہاں خوشنما بنگلے دلفریب مناظر کی سیر کے لئے تعمیر کئے تھے۔ اُس زمانہ میں دریا کے کنارے پر کیا کچھ رونق نہ ہوگی!۔ مگر آہ۔ آج وہ سب باتیں خواب و خیال ہیں!

اس بند کے کچھ آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں راقم الحروف کے اخبار "پنجہ فولاد"[1] کا دفتر لنڈا بازار لاہور کے جنگڑ محلہ میں تھا۔ وہاں ایک شخص نے اپنا مکان بنانے کے لئے جب بنیادیں کھودیں تو اندر سے ایک

[1] آجکل جناب فوق اخبار "کشمیری" کے مالک و مدیر ہیں (گیلانی)

طویل پختہ دیوار نکلی۔ جو مسجد شہید گنج کی طرف سے آتی تھی۔ اور علاقہ محال "نولکھا" کی طرف جاتی تھی۔ مالکِ مکان نے اِس دیوار میں سے اس قدر اینٹیں نکالیں۔ کہ اسے نئی اینٹیں خریدنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ مصری شاہ اور "چاہِ میراںؑ" کے درمیان اب بھی اس بند کے آثار سے ملتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بند ریلوے سٹیشن اور لنڈا بازار کے درمیان سے چاہِ میراں کی طرف جو اُس زمانہ میں دریا بُرد زمین تھی نکل جاتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا مؤلف اس بند کا طول دو کوس بتاتا ہے۔

عالمگیر کی تعمیری یادگار لاہور کی "شاہی مسجد" ہے۔ جو لاہور کی زینت کا باعث ہے۔ اس مسجد کا پتھر دراصل داراشکوہ نے اس غرض سے ہندوستان سے منگوایا تھا۔ کہ چونکہ داراشکوہ سے لیکر "حضرت میاں میرؒ" کے مزار تک ایک پختہ سڑک بنوائے۔ اور حضرت کا روضہ تعمیر کرائے جو صدہا سال تک یادگار رہے لیکن اسکی یہ آرزو بر نہ آئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ عالمگیر نے تمام سنگِ سُرخ ضبط کر کے لاہور میں جامع مسجد تعمیر کرادی۔ اور خدامِ میاں میر صاحبؒ کی معروضات پر حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ بھی تعمیر کرادیا جو آج تک قائم ہے۔ آجکل دریا راوی

ل "چاہِ میراں" جو عام طور پر "میراں دی کھوہی" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی علاقہ میں واقع ہے جہاں پہلے دریا بہتا تھا۔ بند عالمگیری کیوجہ سے جب دریا یہاں سے ہٹ گیا۔ تو یہ جگہ خشک ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ یہاں ایک بَن ہوگیا۔ جس میں اکثر درندے رہتے تھے۔ اور "جاٹ" (جنگلی لوگ) لاہور اور مضافات پر ڈاکہ زنی کر کے اسی بَن میں چھپ جاتے تھے۔ لہنا سنگھ حاکم لاہور نے سمت ۱۸۱۱ بکرمی میں یہاں ایک بستی قائم کی اور اس کے گرد ایک فصیل تعمیر کی۔ سب سے پہلے ایک میر صاحب نے یہاں ایک "کھوہی" (چاہِ خورد) تعمیر کی۔ اِنہی کے نام پر موضع کا نام "میراں دی کھوہی" یعنی چاہِ میراں مشہور ہوگیا۔ سکھوں کے زمانہ میں یہاں بہت سی باغات لگائے گئے۔ حضرت شاہ حسین زنجانی کا مزار بھی اسی جگہ ہے ❖

اس مسجد سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں بہتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بادشاہی مسجد اور قلعہ کے بالکل متصل بہتا تھا۔ خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے :-

"اگرچہ در ہر کوچہ و بازار مساجد بسیار از بسیار است۔ امّا بر کنارۂ دریا محاذی دولت خانۂ والا حضرت عالمگیر بادشاہ مسجدے عالی از سنگ بنا فرمودہ اند کہ زیادہ از پنج لک روپیہ بر آں صرف شدہ"

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور کا ایک نامور شاعر ابوالبرکات منیر کے نام سے گذرا ہے۔ جب عالمگیر کو اشرفی اور روپیہ کے لئے شعروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو ہندوستان کے بڑے بڑے نامی شعراء نے ابیات لکھے۔ انہی میں لاہور کا منیر بھی تھا۔ اس نے اشرفی کے لئے ذیل کا شعر کہا :-

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر　　　شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور روپیہ کیلئے یہ شعر :-

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر　　　شاہ اورنگ زیب عالمگیر

منیر نے انعام کی خواہش ظاہر کی۔ مگر بادشاہ نے جواب دیا۔ کہ یہ کیا کم بات ہے کہ تمہارا نام میرے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیگا !

ایک مشہور فرانسیسی جوہری نے ۱۶۴۱ء سے ۱۶۶۸ء کے درمیان اصفہان سے لیکر لاہور دہلی اور آگرہ تک پاپیادہ سفر کیا ہے۔ وہ عالمگیر کے عہد حکومت کے افتتاح پر لاہور آیا جس کے متعلق وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

(ترجمہ) "لاہور سلطنت کا دارالخلافہ ہے۔ جو پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک کے کنارے واقع ہے۔ دریا پہلے شہر کے متصل بہتا تھا۔ مگر اب تین میل کے فاصلہ پر چلا گیا ہے۔ اور اپنی طغیانی سے گرد و نواح کے علاقہ کو بہت نقصان پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے۔ اس کی لمبائی ایک کوس سے زیادہ ہے۔ اسکی عالیشان

عمارتیں جو آگرہ اور دہلی کی عمارتوں سے بھی زیادہ بلند ہیں عدم توجہی کی وجہ سے گر رہی جاتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں بہت سے مکانات منہدم ہو جاتے ہیں قلعہ جس میں تخت گاہ شاہی ہے۔ بہت اچھی حالت میں ہے۔ اور چونکہ دریا اب اس سے بہت فاصلہ پر ہے اس لئے وہ بالکل محفوظ ہے۔"

ڈاکٹر برنئیر جو عالمگیر کے عہد میں ۱۶۶۴ء میں لاہور آیا تھا لاہور کے متعلق لکھتا ہے:-

(ترجمہ) "یہ ایک نفیس شہر ہے۔ اس کے بازار اور منڈیاں بہت بارونق ہیں ہر جگہ نے غم زرد۔ نے غم کالا کا عالم ہے۔ مکانات اپنی پختگی۔ خوبصورتی۔ بلندی اور شان و شوکت کے لحاظ سے آگرہ اور دہلی کی شاہی عمارات سے کم نہیں"۔

عالمگیر کی بیٹی زیب النساء بیگم نے جو قرآن شریف کی حافظہ اور نہایت عالمہ و فاضلہ شہزادی تھی۔ لاہور میں ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا۔ جواب تک "چوبرجی" کے نام سے راجہ پونچھ کی موجودہ کوٹھی کے متصل "نواں کوٹ" کی طرف موجود ہے۔ بیگم نے اپنا مقبرہ بھی لاہور ہی میں اس باغ کے متصل تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کے گرد عظیم الشان چار دیواری کے اندر ایک اور وسیع باغ لگوایا تھا۔ لیکن دہلی کے خیر نے شاہزادی کو لاہور میں دفن نہ ہونے دیا! سکھوں کے زمانہ میں اس چار دیواری کے اندر "مہر محکم" نے ایک موضع "نواں کوٹ" کے نام سے آباد کیا۔ جواب تک موجود ہے۔

؎ اس موضع میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی تعلیمی سہ گرمیوں کی وجہ سے تین چار سال سے ایک اسلامیہ ہائی سکول جاری ہے۔ پنڈت جنار دھن کا رام باغ جس کو نیا شالامار باغ بھی کہتے ہیں اسی موضع کے متصل ہے۔

بارہ دری میرزا کامران

یہ حسرتناک عمارت ہندوستان میں مغلیہ بادشاہوں کی سب سے پہلی یادگار ہے۔ اس سے بہتر اعلیٰ اور عظیم پیمانہ پر اس سے قبل کسی مغل عمارت کا تاریخ سے پتہ نہیں ملتا۔ تاریخ کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے۔ ہمایوں کے تین بھائی اور تھے۔ میرزا ہندال۔ میرزا عسکری اور میرزا کامران۔ ان میں آخر الذکر پنجاب کا حکمران تھا اور دارالحکومت لاہور میں رہتا تھا۔

مرزا کامران نے ۹۳۷ھ سے ۹۴۲ھ کے درمیان اپنی شاہانہ رہائش اور شاہانہ شان و شوکت کے اظہار کے لئے راوی سے پار قریباً دو میل کے فاصلہ پر شاہدرہ کی جانب ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا۔ جس کے عین مرکز میں فن عمارت کی یہ بےنظیر یادگار یعنی بارہ دری تعمیر کرائی۔

کہنے کو یہ عمارت صرف ایک بارہ دری تھی۔ مگر اس کے ساتھ اور بھی بہت سے شاہانہ طرز کے مکانات تھے۔ زنانہ محلات۔ دیوان عام۔ دیوان خاص مسجد یہ سب چیزیں اس نادرہ روزگار باغ کے اندر واقع تھیں۔ جن کا آج نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔

اس زمانہ میں دریا لاہور کی دیواروں سے ٹکرا کر بہتا تھا۔ اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ طغیانی و سیلاب کے دنوں میں اس کی تند بھینے اور نہ رکنے والی لہریں شہر کے اندر بھی آجاتی تھیں۔ اور اکثر مکانات کو منہدم اور کئی لوگوں کو بےخانماں کر جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اکثر عالیشان عمارتیں اور باغات دریا سے پار اور شہر سے فاصلہ پر تعمیر کئے جاتے تھے۔ تاریخوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہان مغل اور امرائے چغتائیہ نے شاہدرہ کے علاقہ

ہیں بہت سے باغات و مکانات تعمیر کرائے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے جس میں ایک خاص فرقہ کو بوجہ تعصب آج کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ جب دیکھا۔ کہ راوی کی لہریں اہل لاہور کو بیتاب و بے چین کر رہی ہیں۔ اور جو عمارتیں اور باغات[1] شہر کے نزدیک ہیں۔ وہ دریا برد ہوتے جاتے ہیں۔ تو چہارم[2] سال جلوس میں بند عالمگیری تعمیر کرا کر دریا کا رخ شہر سے ہٹا دیا۔ جس سے اہل لاہور آئندہ ان مصیبتوں سے بچ گئے۔

[3] یہ عالیشان عمارت پختہ مصالحہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے جنوب کیطرف سنہ ۱۸۹۵ء تک ایک محرابدار پل کا ایک حصہ باقی تھا۔ اور باغ کی روشوں کی اور بعض دیواروں کی بنیادیں تو اب تک موجود ہیں۔ محمد شاہ کے زمانہ میں اس عمارت کو سب سے پہلا صدمہ پہنچا۔ اس زمانہ میں دریا جو پہلے قلعہ اور بادشاہی مسجد کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا تھا۔ اب بارہ دری کی دیواروں کی پابوسی کر رہا تھا۔ جس کا نتیجہ آخر میں "سیل افگند دیوار را" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بند عالمگیری نے شہر کو تو بچا لیا۔ مگر جس قدر عالیشان عمارتیں اور بے نظیر باغات دریا سے پار تھے۔ وہ دریا کا رخ بدل جانے کی وجہ سے سب ملیا میٹ ہو گئے۔ اور انہی میں مرزا کامران کا باغ بھی تھا۔ جس کے متعلق ٹھاکر نتھن صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ باغ مع محل علاقہ نولکھا سے راوی تک پھیلا ہوا تھا حوض اور فوارے بلکہ سوائے بارہ دری کے باغ کی دیگر عمارتیں سب نیست و نابود ہو گئیں۔ بارہ دری کی تمام عمارت قالبوتی ہے۔ لکڑی کا کہیں نام بھی

---

[1] خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی سال تصنیف سنہ ۱۱۰۸ھ صفحہ ۶۵

[2] بند عالمگیری کے حالات انشاء اللہ علیحدہ تحریر کئے جائیں گے۔

[3] ملاحظہ ہو اخبار رفیق ہند مطبوعہ سنہ ۱۸۹۴ء

ہیں۔ محرابوں کے نیچے مختلف رنگوں میں جو نقش و نگار تھے سنہ ۱۹۴۳ء تک
اُن کے کچھ آثار قائم تھے۔ مگر نیرنگیٔ عالم نے اب وہ بھی مٹا دیئے ہیں
بارہ دری کی عمارت جو مرزا کامران کی نشستگاہ تھی۔ ایسی مضبوط اور
مستحکم بلکہ سخت جان ہے کہ ہرچند محمد شاہ[1] کے زمانہ سے جس کو آج سنہ ۱۳۴۲ھ
میں ۲۰۰ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ راوی کی طوفان خیز موجیں اس
کی تباہی کے درپے ہیں۔ لیکن آج تک سوائے ایک حصہ کے جس کو موجودہ
نسل نہیں جانتی کہ کب منہدم ہوا ہے اور کسی حصہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا
قریباً چار سو سال سے یہ عمارت بدستور کھڑی ہے۔ اور دریا کے ریلوے پل
اور دوسرے پل سے جو سر لوئیس ڈین کے عہد حکومت میں گاڑیوں اور پا پیادہ
چلنے والوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ صاف نظر آتی ہے۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے
جس میں سیاح دیگر قدیم عمارتوں کی طرح اس کی دیواروں چھتوں اور سیڑھیوں
پر مختلف اشعار اور عبارتیں لکھ جاتے ہیں۔

سنہ ۹۴۶ھ میں جب شیر خاں سوری کا اقبال ہمایون کے عروج و اقتدار شاہی
پر غالب آرہا تھا۔ اور ہمایون بھاگتا پھرتا تھا۔ تو اسی عالیشان بارہ دری میں
ہمایون اور اس کے تینوں بھائی اور دیگر امراء ایک آخری اور قطعی فیصلہ کے لئے
جمع ہوئے۔ بھائیوں نے ہمایون کا ساتھ دینے اور شیر خاں کا مقابلہ کرنے
کے لئے اسی باغ اور اسی بارہ دری میں باہم عہد و پیمان کئے۔ مگر دل چونکہ صاف
نہ تھے۔ خصوصاً کامران مرزا شیر خاں کو بھی اپنی حکومت پنجاب کی بحالی کے لئے
خوش رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے آخر کار شیر خاں سب پر کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ
شیر خاں نے شیر شاہ ہو کر جب اپنا ایلچی مرزا کے پاس بھیجا۔ تو مرزا نے اسی

[1] تخت نشینی ۱۷ ذی قعدہ سنہ ۱۱۳۱ھ۔ وفات ۲۷ ربیع الآخر سنہ ۱۱۶۱ھ

باغ میں اس کو اُتارا اور ایک بڑا جشن کیا۔ جس میں تمام امراء۔ غربا بلاتمیز مذہب و ملت مدعو کئے گئے۔

معلوم ہوتا ہے۔ جہانگیری جلوس کے سال اول (۱۰۱۴ھ) میں باغ اور بارہ دری اور محلات کامران اپنی رونق و زیبائش میں سجے کیونکہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد (۱۰۱۵ھ صفر) میں جہانگیر جب اپنے باغی بیٹے سلطان خسرو کی گوشمالی کے لئے آگرہ سے لاہور آتا ہے۔ تو مرزا کامران ہی کے باغ میں فروکش ہوتا ہے۔ اس عبرت انگیز واقعہ کی کچھ کیفیت ماثر الامراء اور پنجاب کی تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد یہاں لکھتا ہوں۔

سلطان خسرو جہانگیر کا بیٹا اکبر کا لاڈلا پوتا اور راجہ مان سنگھ کا عزیز بھانجہ تھا۔ وہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۱۴ھ کو قلعہ آگرہ سے نکل کر لوٹ مار کرتا پنجاب آیا۔ حسن خاں بدخشی رہتاس کا جاگیردار اور عبدالرحیم لاہور کا دیوان تھا ان دونوں کے ایما سے وہ اس مطلب کے لئے کابل کو روانہ ہوا۔ کہ وہاں سے فوج لائے اور باپ کا مقابلہ کرے۔ اُس زمانہ میں دریائے چناب جو آج وزیرآباد سے بھی ایک میل کے فاصلہ پر دُور ہے سوہدرہ کے متصل بہتا تھا اور سوہدرہ اس دریا کا ایک مشہور گھاٹ تھا جب یہاں سلطان خسرو کی کشتی پہونچی۔ تو ایک مقام پر ریت میں ایسی پھنس گئی کہ باوجود کوشش کے نکل نہ سکی۔ خسرو آخر گرفتار ہو گیا۔ اور گرفتار ہو کر حسن بیگ اور عبدالرحیم کے ہمراہ چنگیز خانی دستور کے موافق پابزنجیر ۳ صفر ۱۰۱۵ھ کو شہنشاہ جہانگیر کے روبرو باغ مرزا کامران میں حاضر کیا گیا۔

شہنشاہ بیٹے کی تنبیہہ و تادیب کے لئے اسی باغ اور بارہ دری میں کئی دن تک مقیم رہا۔ سب لاؤ لشکر اس کے ساتھ تھا۔ یہاں تک محلات اور

ان کے تمام لوازمات بھی اور یہ تمام مختصر سی دنیا اسی باغ کے رکانات میں سمائی ہوئی تھی پس شہنشاہ نے حکم دیا۔ خسرو کو باغ میں نظر بند رکھا جائے ساہو حسن بیگ کو پوست گاؤ اور عبدالرحیم کو پوست خر میں زندہ بند کر دو۔ چنانچہ حسن بیگ تو اسی روز مر گیا اور عبدالرحیم نے دوسرے دن تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

جب شہنشاہ باغ اور بارہ دری کی اقامت ترک کر کے قلعہ میں داخل ہوا۔ جس کی دیواروں کے ساتھ اُس زمانہ میں دریا بہتا تھا۔ تو خسرو کو بھی اسی طرح پابہ زنجیر قلعہ میں لایا گیا۔ اور کس عبرت انگیز اور دردناک طریقہ سے! ذرا ملاحظہ ہو شہنشاہ نے حکم دیا۔ کہ باغ مرزا کامران کے دروازہ سے لیکر قلعہ کے دروازہ تک دو رویہ پھانسیاں نصب کی جائیں۔ اور خسرو کے تمام ساتھی ان پر مصلوب کئے جائیں۔ دوسرے دن خسرو کو برہنہ پشت ہاتھی پر بٹھا کر حکم دیا۔ کہ ان پھانسیوں کے درمیان سے وہ گذرے۔ اور اس سے پوچھا جائے۔ کہ تمہارے خوشامدی اور اہل خدمات تم کو کس طرح سلام کر رہے تھے۔

شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیا میں حضرت میاں میر رح کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ حضرت میاں جیو صاحب (دارا شکوہ حضرت میاں میر کو اسی طرح خطاب کرتا ہے) مرزا کامران کے باغ کے اندر اس عمارت میں جو حوض کے درمیان بنائی گئی تھی۔ اور اب وہ مکان پانی کے نیچے دب گیا ہے۔ بعض اوقات چند خاص خدام کے ہمراہ دن کو فروکش ہوتے اور آرام فرماتے۔

لہ تاریخ لاہور جج محمد لطیف میں لکھا ہے۔ کہ ان کی تعداد سات سو تھی۔ جہانگیر نے ان کو بڑی بڑی تکلیفیں دیکر مروایا۔ جہانگیر خود توزک میں لکھتا ہے۔ میں نے عبرت و سیاست کے لئے ان سب کی زندہ کھالیں کھچوائیں۔

اسی کتاب میں ایک اور جگہ داراشکوہ حضرت میاں میر کے قیام باغ کی ایک کرامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ایک دن حضرت میاں جیو مرزا کامران کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا سیاہ سانپ نکلا۔ شیخ عبدالواحد بنسبانی نے جو کہ ۱۲ سال سے متواتر حاضر باش اور خدمت گزار تھے۔ عرض کیا۔ حضرت ایک بہت بڑا سانپ آپ کی طرف آرہا ہے۔ فرمایا آنے دو۔ جب وہ نزدیک آیا۔ تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سانپ بھی رک گیا۔ اور کچھ آواز سی نکالنے لگا۔ حضرت نے فرمایا۔ بہتر اسی طرح سہی۔ چنانچہ وہ سانپ حضرت کے گرد تین مرتبہ پھرا اور چلا گیا۔ بنسبانی کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا حضرت یہ کیا معاملہ تھا۔ فرمایا سانپ کہتا تھا۔ میں نے دل میں یہ عہد کیا تھا۔ کہ جب آپ کو دیکھوں گا۔ تو تین بار آپ کے گرد پھرونگا۔ میں نے کہا۔ بہتر اسی طرح سہی۔ چنانچہ وہ اپنا کام کر کے چلا گیا ہے۔ بہر حال داراشکوہ کی تحریر سے کم از کم اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس باغ میں ایک اتنا بڑا حوض بھی تھا۔ جس میں رہائش کے قابل ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس تحریر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ داراشکوہ کے زمانہ اور شاہجہان کے عہد ہی میں یہ باغ اور بارہ دری کس مپرسی کی حالت تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حوض تہ آب نہ ہو جاتا۔

ہمایوں جب سنہ ۹۶۲ھ میں آئین جہاں کے تمام نشیب و فراز دیکھ کر ایران سے واپس آیا۔ اور جب کامران نے کابل میں اس کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ تو ہمایوں کے حکم سے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ آخر اسی نابینائی کی حالت میں اپنی سندھی بیگم کے ساتھ وہ حج کو چلا گیا۔ جہاں ۱۱ ذوالحجہ سنہ ۹۶۴ھ کو انتقال کر گیا۔

دریائے راوی پر باغ و بارہ دری مرزا کامران کے سامنے سالہا سال تک

کشتیوں کا پُل رہا ہے۔ اسی زمانہ میں اس بارہ دری میں محکمۂ نہر کے کوئی "صاحب بہادر" رہتے تھے۔ جب سے کشتیوں کا پُل توڑ دیا گیا ہے۔ اور جدید پُل تیار ہوا ہے بارہ دری بالکل خالی ہے۔ اور لوگوں کی سیر و تفریح کے کام آتی ہے۔ چمن بندیاں اور روشیں اب بھی موجود ہیں۔ اتوار کو شوقین لوگ آتے ہیں۔ اور بارہ دری میں بیٹھ کر دریا کی دلفریب روانی اور کشتیوں کی پرکیف دوڑ کے دلچسپ نظارے سے حظ وافر اُٹھاتے ہیں ؂

قلیج خاں اندجانی گورنر لاہور

دارا شکوہ کی رُوح پُرفتوح پر پھولوں کی بارش کرنی چاہیئے۔ کہ وہ اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں کہیں کہیں لاہور کے بعض پُرانے محلوں۔ باغوں اور مکانوں کا بھی سرسری طور سے ذکر کر گیا ہے۔

میں کہ بزرگوں کی ہڈیوں کی حفاظت اور ان کے کارناموں کی اشاعت کو ذریعہ نجاتِ اُخروی اور عماراتِ قدیمہ (موجودہ و معدوم) کی سیر اور ان کے ذکر کو ذریعہ عبرت و بصیرت تصور کرتا ہوں۔ ان ٹکڑوں کو جس دسترخوان سے ملتے ہیں۔ کاغذی کچکول میں جمع کرکے پھر اس انداز سے سجانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہ وہ اہلِ دل اصحاب کی رُوح کو غذائے تازہ کا کام دے سکیں ؂

سکینۃ الاولیاء میں بعض ایسے پُرانے محلات و باغات اور مکانات کا ذکر ہے۔ جو دارا شکوہ کے زمانہ میں لاہور کی زیب و زینت تھے۔ مگر آج جن کا کوئی مٹا ہوا نشان بھی باقی نہیں ہے جس سے ہم یہ اندازہ ہی لگا سکیں کہ وہ فلک نما عمارتیں جنہوں نے لاہور کو عروس البلاد بنا رکھا تھا کہاں واقع

تھیں وہ عالیشان باغات جو اپنی تر و تازگی اور کثرت اثمار و اشجار کے لحاظ سے رشک صد کشمیر اور تختۂ گلزار جنت تھے۔ کس جگہ احداث تھے۔

انہی باغات میں جن کا آج لوگ نام بھی نہیں جانتے - ایک باغ نواب قلیج خان اندجانی کا تھا۔ جس کے اندر نہ صرف زنانہ و مردانہ خوبصورت اور فرح بخش بنگلے تھے۔ بلکہ جس کے فوارے حوض اور جس کے خیابان اور جس کی روشیں ہر ناظر کا دامن دل اس لئے کھینچتی تھیں۔ کہ اس کا چپہ چپہ "بجا ایں جاست" کا مصداق تھا۔

دارا شکوہ لکھتا ہے۔ مرزا کامران نے اپنے باغ کے لئے جو نہر بنائی ہے۔ یہ باغ اس کے جنوب میں واقع ہے۔ اس باغ کے اندر جو عمارت ہے۔ اور جو آجکل خستہ حالت میں ہے۔ حضرت میاں میرؒ دن کو کبھی کبھی یہاں آ نکلتے تھے۔ اور یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔

مرزا کامران کے لاہور میں دو باغ تھے۔ ایک باغ کا نام نولکھا باغ تھا۔ جس کے نام پر لاہور میں اب نولکھا محال قائم ہے - اور اس میں ریلوے سٹیشن۔ سلطانپورہ۔ مصری شاہ۔ فیض باغ اور بعض اور علاقے شامل ہیں دوسرا باغ اس کی بارہ دری برلب دریا کی حدود میں تھا۔ چونکہ لاہور کے بہت سے شاہی باغات اس زمانہ میں تباہ و برباد ہوئے ہیں۔ جب دریائے راوی نے اپنا رُخ "بندِ عالمگیری" کی وجہ سے شاہدرہ اور اس کے مضافات کی طرف بدلا ہے۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ بعض دیگر باغات کی طرح یہ باغ بھی مرزا کامران کی بارہ دری کے کہیں آس پاس واقع ہوگا۔ اور عہدِ عالمگیری یا محمد شاہی دَور میں جب دریا شہر لاہور سے بہت فاصلہ پر ہو گیا تھا۔ دریا بُرد ہو گیا ہوگا۔

قلیج خاں کے کچھ حالات مآثرالامراء کی تیسری جلد سے لکھتا ہوں۔ پڑھو اور غور کرو۔ کہ ایسے جلیل القدر امیر نے کس شان و شکوہ اور کس شوق و دلبستگی سے باغ کی تعمیر کی ہوگی۔ جہاں سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ و سنگ ابری کا حسن برس رہا ہوگا۔ کیا کچھ لاگت نہ آئی ہوگی۔

فتح کشمیر (سنہ ۹۹۴ھ و سنہ ۱۵۵۶ء) کے بعد جب اکبر نے راجہ بھگوانداس اور راجہ ٹوڈرمل کو آگرہ سے کشمیر کے انتظام و انصرام کے لئے روانہ کیا ہے۔ تو نواب قلیج خاں کو بھی ان کے ہمراہ کیا۔ جب یہ پارٹی لاہور پہنچی۔ تو بادشاہ نے بعض مہمات ملکی کے سرانجام کے لئے قلیج خاں کو لاہور ہی میں ٹھہرا لیا۔ جہاں گورنر لاہور کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک وہ کام کرتا رہا +

اکبر کے تئیسویں ۲۳ سال جلوس میں وہ گجرات (دکن) کی صوبیداری کے منصب پر تھا۔

سنہ ۱۰۰۵ھ میں شاہزادہ سلطان دانیال کو جب الہ آباد کی گورنری ملی۔ تو قلیج خان جو شاہزادہ کا خسر اور بادشاہ کا سمدھی تھا۔ اکبر کے حکم سے اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ سال جلوس چہل و ششم سنہ ۱۰۱۰ھ میں قلیج خاں کو پھر پنجاب کی حکومت ملی۔ اور لاہور اس کا صدر مقام قرار پایا۔ جہانگیر کے زمانہ سنہ ۱۰۱۶ھ سال دوم جلوس میں وہ پھر پنجاب آیا۔ اور چھٹے سال جلوس تک لاہور ہی میں رہا۔

صاحب صلاح و تقویٰ تھا۔ باوجود گورنر پنجاب ہونے کے طالبانِ علم کو خود درس دیتا تھا۔ اس نے لاہور میں ایک دار العلوم بھی اپنے ذاتی خرچ سے بنایا تھا۔ جس میں فقہ اور حدیث و تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی کوشش سے پنجاب کے مختلف اقطاع میں علوم شرعیہ کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔

قلیچ خاں شاعر بھی تھا۔ اور اُلفتی تخلص کرتا تھا۔ یہ رباعی اسکی یادگار ہے

عاشق ہوسِ وصال در سر دارد　　صوفی زرقے ز خرقہ در بر دارد
من بندۂ آں کسم کہ فارغ ز ہمہ　　دائم دلِ گرم و دیدۂ تر دارد

اندجاں ایران کے کسی قبیلہ یا شہر کا نام ہے۔ اسی لئے اس کو اندجانی کہتے تھے۔ اس کے بیٹوں میں مرزا سیف اللہ اور مرزا چین قلیچ بڑے مشہور اور نامی امیر گذرے ہیں۔ اسی قلیچ خاں اندجانی ناظم لاہور کی مدح میں دربارِ جہانگیری کے نامور شاعر طالب نے ایک رات میں ۴۴ بیت کا قصیدہ لکھا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی روانیٔ طبع پر ناز کرتا ہوا لکھتا ہے

منم کہ نیست چو من شاعرے ز اہلِ سخن　　منم کہ نیست چو من قائلے ز اہلِ کلام
گواہ ایں دو سہ معنی ہمیں قصیدہ بس است　　کہ یافت از سرِ شب تا سپیدہ دم اتمام

مقبرۂ جہانگیر

(دور اوّل باغ مہدی قاسم خاں)

نواب مہدی قاسم خان اکبر کے نامی اور معزز سرداروں میں تھے۔ ان کے اقتدار کا اس سے اندازہ کرلو۔ کہ ان کا بھانجہ اور داماد حسین خاں ٹکریہ[1] اکبر کے

[1] دربار اکبری میں لکھا ہے۔ ایک دراز ریش مرد معقول اسکے دربار (لاہور) میں آیا حسین خاں مرد بزرگ سمجھ کر تعظیم کو اُٹھے۔ مزاج پرسی کے بعد معلوم ہوا۔ کہ یہ تو ہندو ہے۔ اسی دن حکم جاری کردیا کہ ہندو کندھے کے پاس رنگین کپڑے کا ایک ٹکڑا لگوایا کریں۔ لاہور تو زندہ دلوں کا مسکن ہے۔ ٹکڑی کہہ کر لوگوں نے ٹکریہ نام رکھ دیا۔ چنانچہ اخیر دم تک یہ لفظ نام کا جزو رہا ✦

عہد[1] میں پنجاب کا گورنر رہا ہے ٭
سنہ ۹۷۰ھ میں مہدی قاسم خاں اس لاؤ لشکر اور شان و شوکت کے ساتھ حج کو گئے۔ کہ ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ گورنر پنجاب سمندر کے کنارے (سورت) تک ان کو رخصت کرنے آیا۔ وہ زمانہ سفر کی آسائشوں اور ریل گاڑیوں کی موج بہار کا نہیں تھا۔ اور نہ ان ایام میں وہ کیفیت تھی کہ لاہور سے چھوٹے تو بمبئی میں جا کے دم لیا۔ اس زمانہ میں منزل منزل بلکہ قدم قدم چلتے تھے۔ اور کم سے کم دو تین سال کے لئے اپنے وطن سے جدا ہوتے تھے۔ نواب مہدی قاسم خاں بھی سنہ ۹۷۲ھ میں حج سے واپس آئے۔
مہدی قاسم خاں نے سنہ ۹۶۵ھ کے پس و پیش دریائے راوی کے پار ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا۔ کتابوں اور تاریخوں میں باغ کا کوئی خاص نام نظر سے نہیں گذرا۔ سب جگہ باغ مہدی قاسم خاں ہی درج ہے۔ ان کے رسوخ و اقتدار اور ان کے تمول و اعزاز کو نگاہ رکھ کر خیال کرو۔ باغ پر اسکی آرائش پر اس کی عمارات پر کیا کچھ صرف نہ ہوا ہوگا ٭
یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ اکبر لاہور کی رونق و آبادی کے لئے خود لاہور میں مقیم تھا۔ اس نے خود بھی عالیشان محلات تعمیر کرائے۔ اور اس کی تقلید میں امراء و وزراء نے مکانات و باغات کی کثرت سے لاہور کو عروس البلاد بنا دیا۔
باغ مہدی قاسم خاں میں (بانیٔ باغ کے انتقال کے بعد) مرزا محمد حکیم اکبر کے سوتیلے بھائی نے ۱½ ماہ تک دن عید اور رات شب برات کا جشن منایا ہے۔ جس کی کچھ کیفیت اس طرح ہے۔ کہ سنہ ۹۷۴ھ میں وہ کابل میں تھا۔ وہاں اس کے دماغ میں پنجاب و لاہور پر قبضہ کرنے کا خبط سمایا۔ کابل سے

---

[1] سنہ ۹۶۵ھ میں تقرری کا پتہ چلتا ہے ٭

فوج عظیم لیکر نکلا۔ اور بھیرہ وغیرہ مشہور مقامات کو لوٹتا ہوا لاہور کی حدود تک آ پہنچا۔ اکبر کی طرف سے (حسین خاں ٹکریہ کے بعد) اس زمانہ میں میر محمد خاں حاکم پنجاب تھا۔ اس نے قلعہ کو مستحکم کر کے بادشاہ کو اس ہنگامہ کی خبر پہنچائی مرزا نے اڑھائی ماہ تک باغ مہدی قاسم خاں میں قیام رکھا۔ قلعہ پر بہت دفعہ حملہ کیا۔ مگر محصورین کی توپ و تفنگ نے ہر بار ناکام رکھا۔ جب سنا۔ کہ اکبر دریائے ستلج عبور کر آیا ہے۔ تو بھاگ کر کابل چلا گیا۔

سنہ ۹۸۹ھ میں مرزا محمد حکیم حاکم کابل کو پھر بعض نمک حرام کابلی افغانوں اور نئے پرانے ترکوں کی تحریک و ترغیب سے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا خیال آیا۔ اپنے ہواخواہوں اور اپنی فوجوں سمیت پھر راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں اُترا۔ راجہ بھگوانداس۔ کنور مان سنگھ (بعد میں راجہ مان سنگھ) سید حامد بارہ اور چند امرائے دربار شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔

مرزا حکیم نے بیس یوم تک باغ مذکور میں خوشی کی بہاریں منائی تھیں۔ کہ اقبال اکبری کے سرہند میں پہونچنے کی خبریں گوش زد ہونے لگیں۔ محاصرہ ترک کیا۔ باغ کی بہار سے منہ موڑا۔ اور فراری و اضطراب کے وحشت غارزار میں قدم رکھا۔ جہانگیر کے وسط اور اواخر عہد حکومت میں لوگ مہدی قاسم خاں کا نام بھول چکے تھے۔ اور اگر "بھول چکے تھے" غلط ہے تو "بھول رہے تھے" یقیناً صحیح ہے۔ جیسا کہ اس باغ کے دوسرے دَور سے معلوم ہوگا ٭

(دوسرا دَور باغِ دل گشا)

نواب مہدی قاسم خاں کی اولاد نرینہ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ صرف ایک بیٹی تھی۔ جو حسین خاں ٹکریہ کی بیوی تھی۔ البتہ حسین خاں کا ایک بیٹا یوسف خاں

جہانگیر کے دربار میں تھا۔ یوسف خاں کا ایک بیٹا عزت خاں تھا۔ جو شاہجہان کی سلطنت میں حقِ خدمت ادا کرتا تھا۔ اس کے آگے میدان صاف نظر آتا ہے۔

جب مہر النسا نور محل اور نور محل سے نور جہاں بنی۔ اور اس کے عروج واقبال کی ضیاء پاشیوں کے آگے کسی کو آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ رہی۔ تو اس نے مہدی قاسم خاں کے باغ پر جو اس زمانہ میں لاہور کا ایک بے نظیر باغ اور بیحد سیرگاہ تھا۔ اپنا قبضہ کر لیا۔ اور اس قبضہ کی کچھ یہ وجہ بھی تھی۔ کہ اس زمانہ میں کسی امیر وزیر کے انتقال پر اور خصوصاً اولادِ نرینہ سے محروم مرنے پر اسکی جائداد بادشاہِ وقت کا حق سمجھی جاتی تھی ٭

نور جہاں نے اس باغ کا نام دلکشا رکھا۔ اور دل کھول کر اس کو رونق دی۔ اس کی طبیعت میں اختراعات و ایجادات کا مادہ تھا۔ گلزار و مرغزار۔ اور قدرتی نظاروں کی عاشق تھی۔ خدا جانے باغ کو کیا کچھ سجایا ہوگا۔ کس قسم کی رونق دی ہوگی۔ جب اس میں بیگمات کا جھرمٹ ہوتا ہوگا۔ تو کس اہتمام سے پردہ اور پہرہ کا انتظام ہوتا ہوگا۔

مہر مہنگا ولد مہر جلیھا بانی باغبانپورہ (لاہور) کے ننھیال باغ دلکشا کے داروغہ تھے۔ جب شہزادے اور شاہزادیاں اور بیگمات باغ دلکشا کی سیر کو آتے تھے۔ تو مہر مہنگا اپنی خورد سالی کیوجہ سے باغ کے اندر ہی رہتا تھا۔ اسی تعارف و تقرب کی وجہ سے وہ اپنے زمانہ میں شالامار باغ اور دیگر باغہائے سرکاری کا داروغہ مقرر ہو گیا تھا۔ مہر مہنگا ۱۸۰۱ء میں انتقال کر گیا ٭

اس ثبوت میں کہ باغ دلکشا اسی باغ کا نام ہے۔ جو مہدی قاسم خاں نے اکبری عہد میں احداث کیا تھا۔ مولانا آزاد کی چند سطور یہاں درج کرتے ہیں جو انہوں نے دربارِ اکبری میں اکبر کے بھائی مرزا حکیم کی بغاوت کا ذکر کرتے

ہوئے لکھی ہیں۔ فرماتے ہیں: "مرزا حکیم اٹک اُتر کر بھیرہ کو لوٹتے ہوئے لاہور آئے۔ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں جہاں اب مقبرہ جہانگیر ہے آن اُترے[1]"۔

(تیسرا دور مقبرہ جہانگیر)

جہانگیر نے ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں راجوری کے متصل جب مقام چنگس[2] میں وفات پائی۔ تو موت سے پیشتر لاہور میں دفن کیے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ جہانگیر کو اپنے باپ کی طرح خطۂ لاہور سے بڑی محبت تھی۔ اور شاید اس لیئے بھی تھی۔ کہ اس کی چاہتی بیگم نور جہاں لاہور کی بہت دلدادہ تھی۔ بلکہ جہانگیر کے مرنے کے بعد اپنے آخری وقت (۱۰۵۵ھ) تک اس نے لاہور سے قدم باہر نہیں نکالا۔ بلکہ مرکر بھی لاہور ہی میں دفن ہوئی۔ اس کا ذیل کا شعر اسکی اس محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو مرتے دم تک اسے لاہور کے ساتھ تھی ؎

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم ‏ ‏ جاں دادہ ایم جنت دیگر خریدہ ایم

بہرحال جب جہانگیر کی لاش لاہور آئی۔ تو اس کی رفیق زندگی نور جہاں کے باغ دلکشا واقع شاہدرہ میں دفن کی گئی۔ جس پر بعد میں شاہجہان نے ایک

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۸۲۵ [2] چنگس راجوری اور بھمبر کے درمیان پنجاب سے براہ گجرات و بھمبر کشمیر کو جاتے ہوئے دامن کوہ میں برلب دریائے بتیا ایک چھوٹا سا پڑاؤ آتا ہے۔ یہاں ڈاک بنگلہ اور پولیس چوکی کے پاس ایک قبر ہے۔ جس پر سبز جھنڈا آویزاں رہتا ہے۔ مَیں نے وہ قبر پونچھ (کشمیر) جاتے ہوئے دیکھی ہے معمولی سی قبر ہے۔ اس پر اینٹوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ شہنشاہ جہانگیر کی قبر ہے۔ لیکن واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔

عالیشان عمارت تعمیر کی۔ جو آج مقبرہ جہانگیر کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس نے اس قدر شہرت و عظمت حاصل کر لی ہے۔ کہ آج نہ کوئی مہدی قاسم کا نام جانتا ہے اور نہ کسی کو اس کے دل کشا ہونے کا حال معلوم ہے ❊

جب تک مغلیہ حکومت برسر اقتدار رہی۔ مقبرہ کی عالیشان عمارت کو کسی قسم کا گزند نہ پہونچا۔ یہاں تک کہ ۱۷۵۲ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور کے مغل گورنر نواب میر معین الملک عرف میر منو کو چار ماہ تک لڑائی کرنے کے بعد آخر شکست دی ہے۔ تو اس زمانہ میں بھی مقبرہ جہانگیر اور باغ دلکشا کی عمارتیں ہر قسم کے صدمہ سے محفوظ تھیں۔ نواب معین الملک نے پچاس لاکھ روپیہ نقد چند راس اسپ اور زنجیر فیل معہ ہودج نقرہ دیکر اپنی جان بچائی۔ اور ان تمام اشیاء کے معاوضہ میں سوا لاکھ روپیہ کا خلعت صلح حاصل کیا۔ اِس فاتحانہ صلح کے بعد احمد شاہ نے مقبرہ جہانگیر اور باغ دلکشا کی وسیع اور دلچسپ اراضی میں صلح کا جشن دھوم دھام سے منایا۔ اور چند روز تک عیش و عشرت کا بازار گرم کر کے کابل چلا گیا ❊

۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۹ء تک سہ حاکمان لاہور نے لاہور میں جو اودھم مچایا ہے۔ اور اسلامی عمارات کے ساتھ جس بیدردی کا سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد سکھوں کی سلطنت (از ۱۷۹۹ء تا ۱۸۴۹ء) میں شہنشاہوں اور عزیزوں کی اس آخری منزل مقبرہ کو جو حادثے پیش آئے ہیں۔ ان کی کیفیت نہایت دردناک ہے۔ ہم تھوڑا تھوڑا ذکر ان واقعات کا کرتے ہیں۔ ۱۸۱۰ء تا ۱۸۴۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ چار پلٹنیں اور دو توپخانے لیکر اس غرض سے قلعہ سے نکلا۔ کہ منٹھ لوانہ کے قلعہ نورپور کو اپنے قبضہ میں لائے۔ اور سردار دل سنگھ قلعدار مکھڈ کی مدد کرے۔ پہلی منزل مقبرہ جہانگیر قرار پائی۔ سکھ سرداروں نے باغ کو تہس نہس کر دیا۔

اسی اثناء میں خبر آئی - کہ قلعہ نورپور فتح ہو گیا ہے - مہاراجہ نے اسی باغ مقبرہ جہانگیر میں جشن منایا - لاہور سے اور بھی بہت سی فوجیں منگوائیں - اور باغ کو بہت حد تک ویران کر دیا -

۱۸۱۸ء میں مہاراجہ نے مہم پشاور کی تیاری کے لئے مقبرہ جہانگیر میں پندرہ دن تک قیام کیا - مہاراجہ اور اُس کے نامی جاگیردار اور سردار اور ماتحت راجے مقبرہ کی عمارات اور سرائے اور سرائے کی مسجد میں مقیم رہے ۔

باغ کے عین وسط میں جہانگیر کا مقبرہ ہے - جس کی چھت پر سنگ مرمر کی سفید چاندنی کا نور برس رہا ہے - اور جس کے فرش اور تعویذ مرقد اور چبوترہ کی گلکاری بھی عجب بہار دے رہی ہے - سنگ عقیق - لاجورد آسمانی - نیل کنٹھ - زہر مہرہ - مرجان اور سنگ ابری وغیرہ نے فرش کو دیدہ زیب بنا دیا ہے - جب نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے پنجاب اور دہلی پر ہوئے - تو ایرانیوں اور درانیوں نے گلکاری کو جواہرات سمجھ کر کسی کسی جگہ سے اُکھاڑ لیا - سکھوں کے زمانہ میں پہلے یہاں ارجن سنگھ بن ہری سنگھ نلوہ مقیم رہا - اس نے بھی باغ اور مقبرہ کو اُجاڑنے میں پوری سنگدلی سے کام لیا ۔

جب سردار سلطان محمد خاں برادر خورد امیر دوست محمد خاں والئے کابل مہاراجہ کے پاس آیا - تو شاہدرہ معہ مقبرہ انہیں کو جاگیر میں ملا - وہ بارہ سال تک زندہ درگور مقبرہ کے اندر رہا - اس نے اور اس کے آدمیوں نے مقبرہ کے پتھروں اور نگینوں اور مقبرہ کے باغ کو بہت کچھ ویران کیا ۔

مہاراجہ نے بھی تمام کٹہرے سنگ مرمر - سنگ سرخ اُکھڑوا کر دربار صاحب امرتسر اور رام باغ میں نصب کرائے - اس پر بھی اس مکان عالیشان کا وہ جاہ و جلال ہے - کہ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں - مقبرہ کے

چار مینار ہیں - ہر مینار کی تین منزلیں ہیں - اور ہر منزل پر جانے کے لئے بادشاہی مسجد کی طرح سیڑھیاں موجود ہیں - ہر منزل کے گرد سنگِ مرمر کا جالی دار کٹہرہ موجود تھا - مگر سکھوں نے سب اُتروا لیا - اسی طرح چھت کی وسیع و طویل منڈیر بھی جالیدار سنگِ مرمر کی تھی - وہ بھی بیدردوں نے اُتروا لی - اب سرکار انگریزی کی توجہ سے پھر سنگ مرمر کی جالیاں لگ رہی ہیں - سرکار انگریزی نے اس باغ اور مقبرہ کی عمارت کو از سرِ نو رونق بخشی ہے - قبر کے تعویذ کے گرد تین طرف سنگِ مرمر کی بلند جالیاں لگی ہوئی ہیں - دیواروں پر ابھی تک شاہجہانی نقش و نگار موجود ہیں - زمین اس باغ کی جو چار دیواری کے اندر ہے - ایک سو بیگہ ہے - تیس بیگہ زمین عمارتی ہے - جس پر سڑک پختہ مع فوارہ وغیرہ موجود ہے - اور بقیہ مزروعہ ہے - ہر گوشہ میں چار چار تختے ہیں - اور ہر تختہ میں نہر رواں اور سڑک پختہ ہے - اور اشجار ثمردار اور سبزہ زار کا عالم اور انگریزی طرز کے گل بوٹے آنکھوں کو طراوت دیتے ہیں -

مقبرہ کے گرد آٹھ عالیشان حوض ہیں - ہر حوض میں چھوٹی چھوٹی آبشاریں ہیں -

باغ کی آبیاری کے لئے بادشاہی زمانے کا بڑا کنواں چار دیواری کے باہر دروازہ سرائے و مسجد سے دائیں ہاتھ پر ہے - پہلے اسی چاہِ کلاں کے پاس سے مقبرہ کا راستہ تھا - مگر اب چند سالوں سے یہ راستہ بند ہے - یہ کنواں چھ چاہ چرخ چوب والوں کا کام دیتا تھا - باغ کے اندر چار کنوئیں ہیں - غربی کنواں لہنا سنگھ[1] احد الحاکم لاہور کا تعمیر کردہ ہے - شمالی فقیر عزیز الدین نے بنوایا تھا - شرقی کنواں راجہ فیض طلب خاں - اور جنوبی چاہ مسٹر ویڈربرن ڈپٹی کمشنر لاہور نے

[1] بھمبر کا راجہ تھا - جو آجکل ریاست جموں کی ایک تحصیل ہے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۴۲)

جاری کرایا تھا۔

مقبرہ کی چار دیواری کے ساتھ ہی غربی جانب ایک عالیشان اور وسیع سرائے ہے۔ جس کو ایک بلند اور خوبصورت ڈیوڑھی نے باہم ملحق کر دیا ہے۔ اس سرائے میں تین گنبدوں کی ایک وسیع مسجد بھی ہے۔ صحن مسجد کا خشتی استرکار حوض موجود ہے۔ مگر اس کا فوارہ بند ہے۔ اسی سرائے میں ۱۸۹۶ء میں غلام پہلوان مرحوم اور بگو سنگھ کی کشتی ہوئی تھی +



قلعۂ لاہور

لاہور کا عظیم الشان شہر ہر چند صدیوں سے دار الحکومت چلا آرہا ہے۔ لیکن پختہ قلعہ بنانے کا کبھی کسی کو خیال نہ آیا۔ بعہد محمود غزنوی ۴۱۲ھ میں یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ اس زمانہ سے لے کر لودھیوں کے آخری دور اور مغلیہ حکومت کے ابتدائی دو بادشاہوں نے بھی اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کہ اس شہر کی شان و اہمیت کے مطابق یہاں ایک مستحکم قلعہ بھی بنانا چاہیئے +

عہد اکبری۔ اکبرؒ کے زمانہ سے مغلیہ حکومت کا عہد زرین شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اسی بادشاہ نے لاہور کی آبادی و رونق کے لئے ایک

راجہ دھیان سنگھ وزیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عداوت سے جو قلمرو جموں کے تمام راجگان کو نابود کر کے اپنے خاندان کا واحد سکہ بٹھانا چاہتا تھا۔ راجہ فیض طلب خاں کو بہت نقصان پہونچایا۔ آخر بیچارے کو ریاست سے خارج کر کے لاہور میں نظر بند رکھا گیا۔ اور بھمبر شامل خالصہ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۱ء کے قریب کا ہے +

عظیم الشان قلعہ کی ضرورت محسوس کی۔ پُرانے قلعہ کو جو نہ شاندار تھا اور نہ مستحکم بلکہ آب و گِل کا ایک بھدا سا مجموعہ تھا۔ ڈھایا۔ اور اس کی بنیادوں پر پختہ خشتی قلعہ بنوایا۔ اور اس میں عالیشان ایوانات تعمیر کرائے۔ اس کو اس قدر فراخ کیا۔ کہ اس میں خاصہ ایک شہر آباد ہو سکتا تھا۔ قلعہ کی دیوار نہ صرف پختہ اور بلند ہی ہے۔ بلکہ اس قدر چوڑی ہے۔ کہ اس پر توپ آسانی سے چل سکتی ہے۔ اس قلعہ نے اکبر کے زمانہ سے دور انگلشیہ کے موجودہ ایام تک جس کو آج سوا تین سو سال کے قریب عرصہ ہو چکا ہے عیش و عشرت کے جلسے قتل و غارت کے ہنگامے اور خوشی و غم۔ تخت و تختہ اور موت و حیات کے عبرت انگیز انقلابات عظیم دیکھے ہیں۔ ہم سلسلہ وار ان کا تھوڑا تھوڑا ذکر کرتے ہیں۔

یہ قلعہ شہر کے شمالمغربی حصہ میں ہے۔ اور گو اس کی بیرونی دیواریں کئی مقامات سے شکستہ ہو گئی ہیں۔ لیکن اب بھی عظمت گذشتہ اس کی ایک ایک اینٹ سے نظر آ رہی ہے۔ اسی قلعہ میں بیٹھ کر اکبر نے فتح کشمیر اور کوہستان سوات وغیرہ کی تنبیہہ و تادیب اور قندہار و کابل کے انتظامات کے احکامات جاری کئے ہیں۔ اکبر کی مذہبی آزادی کا شباب و شوق پنڈتوں اور مسلمانوں بلکہ پادریوں تک کے مذہبی و علمی مناظرے اسی قلعہ میں دیکھتا رہا ہے۔ شاہی ایوانات کی دیواروں پر نظر دوڑاؤ۔ تمہیں بہت سی منقش تصویریں نظر آئینگی ان میں مرزا رستم سابق شاہِ قندہار۔ خان خاناں۔ راجہ مان سنگھ اور خان اعظم بڑے شان و شکوہ سے بیٹھے ہوئے دکھائی دینگے ÷

بادشاہ خود تو مذہبی قیود سے آزاد تھا۔ اور اس کے اکثر اہل غرض درباری بھی اس کے مریدانِ خاص میں شامل تھے۔ لیکن پھر بھی بعض ایسی نیک ہستیاں

موجود تھیں۔ جو خداوندِ مجازی کی فرمانبرداری کے ساتھ ہی خداوندِ حقیقی کی اطاعت گذار بھی تھیں۔ انہی لوگوں کے لئے بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ قلعہ میں دیوانِ عام کے سامنے جو چبوترہ ہے۔ اس پر ایک مختصر سی مسجد بنوادو۔ کہ بعض اشخاص بحالتِ حضوری کارِ ضروری میں مصروف ہوتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو تو انہیں دور نہ جانا پڑے۔ ہمارے سامنے نماز پڑھیں اور پھر حاضر ہو جائیں۔ درباری حکیموں میں حکیم مصری کے نام سے ایک حکیم تھے۔ جن کو شیخ فیضی سفارتِ دکن سے واپسی پر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ بڑے خوش مزاج۔ ظریف طبع۔ طب میں ماہر کامل اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں فرید و حید۔ انہوں نے تعمیر مسجد پر دو شعر لکھے۔ بادشاہ کی مذہبی آزادیوں اور اس کے مذہبی عقائد کو ذہن میں رکھ کر دیکھو۔ ان دو شعروں کے مختصر سے ترکش میں دوسرا شعر کیسا تیر نشتر چبھو رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

شاہِ ما کرد مسجدے بنیاد   ایہا المومنون مبارکباد

و ندریں نیز مصلحت دارد   تا نمازاں گذار بشمارد

اس زمانہ میں دریائے راوی کی لہریں ثمن برج کے پاؤں میں لوٹتی اور اس کی موجیں قلعہ کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتی تھیں۔ چنانچہ ۹۹۷ھ میں جب اکبر نے شیخ کمال بیابانی کو اس کی جعلسازی کی سزا دینی چاہی تو حکم دیا۔ کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قلعہ کے برج پر سے دریا میں گرادو۔ اگر کچھ کرامت ہے۔ تو صحیح سلامت باہر نکل آئیگا۔ ورنہ اپنے کئے کی سزا پائیگا آج دریائے راوی جو قلعہ سے دو میل پرے ہٹ گیا ہے۔ اور قلعہ کی دیواروں کی بجائے مرزا کامران کی بارہ دری سے سر ٹکرا رہا ہے۔ اس زمانہ میں قلعہ کے اس قدر نزدیک تھا۔ کہ ثمن برج سے اگر کسی آدمی کو نیچے گرایا جاتا۔ تو وہی

[1] دربارِ اکبری مولانا آزاد صفحہ ۱۰۶

نک زمین دریا کی صورت میں اپنا منہ کھولے ہوئے اس کو نگل جانے کے
ئے تیار رہتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ قلعہ کے اندر جو محلات و مکانات
شرق کی طرف ہیں۔ وہ اکبری عہد کے بنے ہوئے ہیں +

دورِ جہانگیری۔ جہانگیری عہد (۱۶۰۵ء) شروع ہوتے ہی قلعہ لاہور
خون خرابہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کا بیٹا خسرو آگرہ سے بھاگ کر لاہو
ا۔ اور باپ کا مقابلہ کرنے لگا۔ لاہور کے عمال شاہی نے شہر کے دروازے
فوظ و مضبوط کر لیے۔ اور قلعہ کے برجوں اور اس کی دیواروں میں جہاں
ہاں شکست و ریخت تھی اس کی مرمت کی۔ اور قلعہ کی دیواروں پر توپیں
ھادیں۔ خسرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ کہ اگر قلعہ کو فتح کر لو۔ تو کامل سات
م تک تم کو شہر کے لوٹنے کی اجازت دی جائیگی۔ ابھی لڑائی شروع ہی ہوئی
ں۔ کہ جہانگیر کے آگرہ سے روانہ ہوتے بلکہ لاہور کے قریب پہونچ جانے
خبر ملی۔ خسرو نے یہ سن کر لڑائی ترک کر دی۔ اور باپ کو روکنے کا انتظام
۔ مگر گرفتار ہوا۔ اور اپنے سپہ سالاروں اور ہمراہیوں کو کچھ جنگ میں قتل کرا کر
سات سو کو پھانسی دلوا کر آپ قلعہ لاہور میں نظر بند ہو گیا۔ اور آخر پانچ
ل کے بعد اسی قلعہ میں مر گیا +

جہانگیر لکھتا ہے۔ میں محرم ۱۰۱۵ھ پنجشنبہ کے دن قلعہ کے اس گنبد میں
ٹھا۔ جو میرے والد ماجد نے ہاتھیوں کی کشتی کا تماشا دیکھنے کے لئے بنوایا تھا۔
گنبد میں بیٹھ کر میں نے خسرو کے سات سو باقی ماندہ ہمراہیوں کو پھانسی
یے جانے کا حکم دیا +

اس واقعہ کے بیس سال بعد ۱۰۳۵ھ میں جہانگیر نے ایک سرحدی ڈاکو
اد نام کی گوشمالی کے لئے بادشاہی فوج کو روانہ کیا۔ لڑائی ہوئی اور انہیں

وہ راہزن جو ایک کثیر جماعت کو لیکر بادشاہی علاقوں پر دست درازی کیا کرتا تھا مارا گیا۔ ۱۹ محرّم کو بادشاہ کشمیر روانہ ہونے والا تھا۔ اسی اثنا میں احداد کا کٹا ہوا سر اس کی خدمت میں پیش ہوا۔ حکم ہوا۔ کہ اسکو قلعہ کے دروازہ پر لٹکایا جائے۔ اور خوشی کے شادیانے بجوائے جائیں۔

جہانگیر نے قلعہ میں عمارات کو بہت توسیع دی۔ برج نما عمارتیں بہت سی اسی کی بنوائی ہوئی ہیں۔ سنہ ۱۰۳۶ھ مطابق سنہ ۱۶۲۶ء میں سر ٹامس ہربرٹ ایک نامی برطانوی سیاح نے جہانگیر کی موت سے ایک سال پیشتر لاہور کو دیکھا ہے۔ وہ اپنے سفرنامہ افریقہ و ایشیا میں قلعہ کی عمارات کے متعلق لکھتا ہے[1] "قلعہ کے اندر ایک محل ہے جس کے دو دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ دربار اور جھروکہ کو جاتا ہے۔ جہاں بادشاہ اپنی عام خاص رعایا کو درشن دیتا ہے۔ دوسرا دروازہ دیوان خاص کی راہنمائی کرتا ہے۔ جہاں رات کو آٹھ سے گیارہ بجے تک بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ بات چیت کرتا ہے۔ محلات و عمارات کی دیواروں پر کئی تصویریں ہیں۔ بعض تفریح طبع کے لئے ہیں اور بعض سے کئی تاریخی معاملات کا انکشاف ہوتا ہے۔ جہانگیر ایک تصویر میں چوکڑی جما کر قالین پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک تصویر میں دائیں طرف اس کا بیٹا سلطان پرویز اور بائیں طرف شاہزادہ خورم ہے۔ اسی طرح آصف جاہ راجہ جگن ناتھ۔ خان اعظم کے بھائی مرزا شریف کی تصویریں بھی ہیں۔ شریف کے گرد تو ایک سو لونڈیوں کا جمگھٹا بھی ہے۔ جس سے اس کا جاہ و جلال اور اس کی عیش و عشرت کا حال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ راجہ رامداس شمشیر بردار۔ راجہ مان سنگھ نگس ران۔ مقرب خاں مسخرہ۔ راجہ رتن سنگھ راجہ بیر سنگھ کی تصویریں دیکھنے

[1] تاریخ لاہور انگریزی مطبوعہ سنہ ۱۸۹۲ء مصنفہ شیخ محمد لطیف مرحوم +

کے قابل ہیں۔ دروازوں پر یسوع مسیح کی کنواری ماں (حضرت مریم) اور صلیب کی تصویریں ہیں۔ ایک مقام پر بابر اور اس کے تین امرا بھی بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امراء کے جلوسوں اور پریوں کی تصویروں اور دوسری تمام قسم کی تصویروں پر ہندو مصوری کا اثر غالب ہے" ❖

جہانگیر ۱۲ بجے دوپہر کو قلعہ کے جھروکہ میں آتا۔ اور ہاتھیوں اور دوسرے جانوروں کی لڑائیاں دیکھتا۔ جہانگیر کو لاہور بہت پسند تھا۔ اس نے اپنی عمر کا آخری حصہ اپنی پیاری بیگم ملکہ نور جہاں کے ہمراہ اسی شہر اور اسی قلعہ میں بسر کیا۔ اُن دنوں عجب لطف ہوتا ہوگا۔ اکبر کے حالات میں کہہ چکے ہو دریائے راوی قلعہ کے پاؤں میں لوٹتا تھا۔ اس کا ثبوت کہ دریا اس زمانہ میں واقعی قلعہ کے پاس ہی بہتا تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بھی ملتا ہے۔ جب خسرو بن جہانگیر کے آدمی لاہور کے ایک دروازہ کو آگ لگا رہے تھے ۔ سعید خان نام ایک بادشاہی امیر راوی پر آیا۔ اور اُس نے کشتی کے ذریعہ قلعہ میں دلاور خاں کو پیغام بھیجا۔ کہ میں مدد کے لئے آیا ہوں۔ لیکن میرے پاس کشتیاں نہیں ہیں۔ کہ میں اپنے آدمیوں کے ہمراہ قلعہ میں داخل ہوسکوں اہل قلعہ نے سعید خاں کو بیس بڑی کشتیاں بھیجیں۔ جن پر وہ ہمراہیوں سمیت سوار ہو کر قلعہ میں آگیا[1]۔ یہ واقعہ ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۰۶ء کا ہے ❖

جہانگیر نے انیسویں سال حکومت یا ۱۰۳۳ھ میں قلعہ کا شاہ برج تعمیر کرایا۔ جس میں شاہجہان نے اپنے عہد میں بہت کچھ ترمیم و اصلاح کی۔ قلعہ کے اندر ایک مسجد اکبر نے تعمیر کرائی تھی۔ ایک مسجد بیگمات اور حرم سرا کی عورتوں کے لئے جہانگیر نے تعمیر کرائی۔ نام اس کا موتی مسجد رکھا۔ یہ مسجد

[1] اٰثار جہند مولانا ذکاء اللہ کارنامہ جہانگیری ❖

تخت کے غربی جانب ہے۔ عبادت کے لئے پچاس فٹ لمبی اور ۲۳ فٹ چوڑی جگہ مخصوص کی گئی ہے۔ مسجد کے دروازہ پر جو کتبہ کندہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ سنہ [illegible] میں "بادشاہ کے ناچیز خادم" معمور خاں کے زیر اہتمام بنی تھی۔

عہد شاہجہانی ۔ شاہجہان نے رجب کے بعد شعبان یا رمضان ۱۰۳۷ھ میں سال جلوس اول ہی میں حکم دیا۔ کہ لاہور اور دہلی کے قلعوں میں ایوان چہل ستون تعمیر کئے جائیں۔ چنانچہ دہلی کی طرح لاہور کے قلعہ میں بھی شاہجہانی عمارات شروع ہوئیں۔ چہل ستون جو چالیس یوم میں تیار ہو گیا۔ دیوان عام کی ایک عالیشان خوشنما عمارت ہے۔ یہ عمارت اس لئے بنائی گئی۔ کہ جب بادشاہ دیوان عام میں دربار کرتے تھے۔ تو تابش آفتاب اور نزول باران کی زحمت سے بچنے کے لئے بندگانِ شاہی کے سر پر کوئی سایہ نہ ہوتا تھا۔ یہ عمارت دولت خانہ خاص و عام کے جھروکہ کے سامنے تعمیر کی گئی۔ اس کا محجر یعنی کٹہرہ چاندی کا تھا۔ چہل ستون کی عمارت ستر گز لمبی اور بائیس گز چوڑی تھی۔ ایوان کی تین طرفیں کھلی ہیں۔ جن میں سے اُمراء منصب دار اور خدمت پیشہ لوگ آتے جاتے تھے۔ جو حسب مراتب اپنے اپنے مقامات پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس عمارت کے آگے ایک وسیع صحن تھا جسکے گرد رنگین چوبی محجر عجب بہار دیتا تھا۔ پھر جب اس پر مخمل و زربفت کا سائبان کھڑا کیا جاتا تھا۔ اور اس میں دو صدی منصب دار اور اُمرا وزرائے درباری جمع ہوتے تھے۔ تو عجب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی۔ دونوں محجروں کے دروازوں پر گرز برداروں اور دربانوں کا جن کا لباس زر تار بجائے خود ان کی امارت اور ان کے رُعب کی علامت تھی۔ پہرہ

رہتا تھا[1]۔ شاہجہان ۱۰۴۴ھ مطابق ۱۶۳۴ء میں ۳ر شعبان کو آگرہ سے روانہ ہوکر ۲۔ شوال کو لاہور پہنچا۔ آصف خاں جو یمین الدولہ آصف جاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور نور جہاں کا بھائی تھا۔ اُس زمانہ میں لاہور کا گورنر تھا۔ بادشاہ نے قلعہ کی عمارات میں شاہ برج اور دولت خانہ خاص اور آرامگاہ دولت خانہ کی عمارتوں کو جو جہانگیر کے زمانہ کی بنی ہوئی تھیں۔ پسند نہ کیا۔ آصف جاہ اور نواب وزیر خاں کو ان کے ازسرنو تعمیر کیے جانے کا حکم دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔ کہ ہماری مراجعتِ کشمیر سے پہلے پہلے یہ عمارات تعمیر ہو جائیں۔ ایک ماہ سترہ یوم کے قیام کے بعد بادشاہ ۲۴۔ ذیقعد کو کشمیر روانہ ہو گیا۔ دیوان خاص کے متعلق درباری شاعر طالبا کلیم نے یہ قطعہ لکھا ہے

این تازہ بنا کہ عرش ہمسایۂ اوست — رفعت حرفے ز رتبۂ پایۂ اوست
باغیست کہ ہر ستون سبزش سرویست — کاسائش خاص و عام در سایۂ اوست

جس دروازہ پر آجکل انگریزی سپاہی پہرہ دیتے ہیں۔ اور جس کے باہر لوہے کا ایک بلند جنگلہ ہے[2]۔ اور جو سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عین بالمقابل ہے۔ اس کو طے کرنے کے بعد ایک اور دروازہ حضوری باغ کے سامنے آتا ہے۔ جس کو ہاتھی پاؤں۔ ہاتھی پول یا ہاتھی پوڑ دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دروازہ قلعہ کے شمال مغربی رُخ پر ہے۔ اس دروازہ سے حرم سرائے

---

[1] ظفر نامہ شاہجہان صفحہ ۶۱ و تاریخ لاہور انگریزی بحوالہ عبدالحمید لاہوری مصنف شاہجہان نامہ [2] یہ مضمون اکتوبر ۱۹۲۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں قلعہ سول حکام کے حوالہ کر دیا گیا۔ اب انگریزی سپاہیوں کی جگہ ایک دیسی سپاہی پہرہ پر کھڑا رہتا ہے۔ اور جنگلہ بالکل اُٹھا دیا گیا ہے۔ مفصل ذکر آگے آئیگا ۔

کی عورتیں اور بیگمات ہاتھیوں پر سوار ہو کر باغات لاہور اور نواح لاہور کی سیر کیا کرتی تھیں۔ دروازہ کی منقش محراب پر مندرجہ ذیل اشعار لکھے ہوئے ہیں ؎

شاہِ جم جاہِ سلیماں قدر کیواں بارگاہ — کز سپہر و مہر برتر بردہ رایاتِ جلال
ثانیِ صاحبقِراں شاہِ جہاں کز عدل خود — نیستش نوشیرواں مانند افریدوں بجال
شاہ جہ حکم کرد احداث کز فرط علو — ہست بیروں ہمچو عرش اعظم از وہم و خیال
در صفا و رفعت و لطف و ہوا برجے چنیں — از حصارِ چرخ ننمود است ننماید جمال
بندۂ بیدل مرید معتقد عبد الکریم — بعد اتمام عمارت یافت ازیں تاریخ سال
دائما چوں دولت ایں بادشاہِ جم سپاہ — ایں ہمایوں برج عالی باد از آفت بے زوال

[illegible] سنہ جلوس

شاہجہان نے قلعہ میں بہت سی جدید عمارتوں کا اضافہ کیا۔ چہل ستون شاہ برج، تختگاہ، خوابگاہ خورد، نقار خانہ اور نقار خانہ کے ساتھ باغ پر لاکھوں روپے نئی تعمیرات میں اس نے صرف کر دیے۔ مثمن برج کی عمارت سنگِ مرمر کی ہے۔ چھتیں مطلا اور مذہب۔ دروازوں پر شیشہ کا بیلدار کام شاہانِ مغلیہ کے گورنر اور ناظم اسی مکلف مکان میں رہا کرتے تھے۔ خوابگاہ خورد ایسی مختصر و مقطع عمارت ہے۔ کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مغربی دیوار کے قریب مثمن برج اور شیش محل موجود ہیں۔ قلعہ کی یہ عمارتیں اب بھی ایسی ہی محفوظ ہیں۔ جیسی کہ شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں تھیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ انہیں مغل بادشاہوں اور اُن کے جانشینوں

[illegible] رنجیت سنگھ کے عہد ۱۲۱۲ھ میں یا اس کے قریب حافظ عظیم اللہ باغبانپورہ کا بیٹا رحیم بخش کچھ عرصہ تک اس باغ کا داروغہ رہا ہے۔ تحقیقاتِ چشتی صفحہ [illegible]

نے کبھی فوجی بارکوں کے لئے استعمال نہیں کیا۔ مغربی جانب ایک نولکھا محل ہے۔ ہر چند اس کی عمارت اب خستہ ہے۔ اور چھت بھی اچھی حالت میں نہیں ہے۔ اسے خوشنما پتھر کے بنے ہوئے پھولوں سے جو دیواروں میں نصب ہیں سجایا گیا ہے۔ کہتے ہیں۔ اس پر نو لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس عمارت کو شاہجہان نے بنایا۔ اور اس کے بعد اورنگ زیب نے تکمیل تک پہنچایا تھا۔

جہانگیر کی وفات (۲۷۔ صفر ۱۰۳۷ھ) کے وقت اس کا بیٹا شہریار لاہور میں تھا۔ اور اس کے ساتھ اور بھی کئی شہزادے اسی قلعہ میں تھے۔[۱] آصف جاہ نے لاہور آکر شاہزادوں کو باہم لڑوایا۔ اور ہزارہا آدمی ہلاک کرانے کے بعد ان تمام شاہزادوں کو بھی ۲۶۔ جمادی الاول یعنی جہانگیر کی وفات کے تیسرے مہینے کے بعد تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اپنے داماد شاہجہان کو تخت و سلطنت کی مبارکباد دی۔ اور یمین الدولہ آصف خان کا خطاب حاصل کیا۔ یہ سب شاہزادے اسی قلعہ کے اندر ہلاک کئے گئے تھے مسجد ول کے علاوہ قلعہ کے اندر ایک مندر بھی ہے۔[۲] جو اب تک محفوظ و سلامت ہے اور جو مغل شہنشاہوں کی مذہبی فراخدلی کا ایک روشن ثبوت ہے۔ یہ مندر ایک گہرے خلا یعنی تہ خانہ میں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ چھوٹا سا مندر راجہ رامچندر جی کے بیٹے راجہ لوہ بانئے لاہور کا بنایا ہوا ہے۔ مندر کی سطح اور قلعہ کی بیرونی سطح چونکہ مساوی ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مندر بہت پرانا ہے۔ اور قلعہ کے تعمیر کرنے والوں نے اس کو صحیح و سلامت رہنے

---

[۱] شہزادہ داور بخش اور اس کا بھائی گرشاسپ بن خسرو بن جہانگیر۔ شہریار بن جہانگیر۔ طہمورث ہوشنگ پسران دانیال خلف اکبر۔

[۲] تاریخ لاہور انگریزی۔

دیا ہے ؛

اس مندر کے متعلق سناتن دہرم یودک سبہا لاہور گورنمنٹ کے ساتھ کچھ عرصہ سے خط وکتابت کر رہی ہے۔ چنانچہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کو یودک سبہا کے ممبران معہ صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ موقع دیکھنے کے لیے گئے۔ اور چاروں طرف سے صفائی اور کھدائی شروع کرادی گئی۔ مندر یا سمادھ کے متصل ہی ایک گہرا گڑھا ہے۔ جس میں ایک خستہ سا گنبد نظر آتا ہے۔ گڑھے کی یہ سطح دو فٹ اوپر تک اینٹوں اور مٹی سے دبی ہوئی ہے۔ اس سے دو فٹ نیچے ایک فرش نکلا ہے۔ جس کی سطح حضوری باغ کی سطح کے برابر ہے۔ صفائی اور کھدائی کے بعد ۱۳۔ دسمبر کو سمادھ میں سے ہاتھوں کی انگلیوں کی ہڈیاں جو موجودہ نسلوں کی انگلیوں سے بہت بڑی ہیں۔ اور نہایت تیز دانت برآمد ہوئے۔ ان چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس وقت کے انسان آجکل کے انسانوں کی نسبت قد و قامت میں زیادہ لمبے اور طاقت جسمانی میں بھی زیادہ تھے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ ہڈیاں دبقول مہاراجہ رامچندر جی کے بیٹے راجہ لو کی ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کے خیال میں یہ ہڈیاں مہاتما بدھ سے بہت پہلے زمانہ کی ہیں۔ اور کسی غیر معمولی انسان کی ہیں ؛

دور عالمگیری - عالمگیر شہزادگی کے زمانے میں اپنے دوسرے بھائیوں کے ہمراہ قلعہ میں رہا ہے۔ جب آصف جاہ نے پانچ تیموری شہزادوں کو قلعہ کے اندر قتل کرایا ہے۔ اُس وقت عالمگیر اور اُس کے دوسرے بھائی سب قلعہ کے اندر ہی تھے۔ شاہجہان ان دنوں آگرہ

سے آگرہ آپہونچا تھا۔ آصف جاہ شہزادوں کو ہمراہ لے کر آگرہ چلا گیا۔
اس کے بعد جب شاہجہان اپنے بیٹے عالمگیر کے ہاتھوں سنہ ۱۰۶۸ھ میں معزول ہو کر آگرہ کے قلعہ میں نظر بند ہوتا ہے۔ تو عالمگیر اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کے تعاقب میں لاہور آتا اور قلعہ کی بجائے شالامار باغ میں مقیم ہوتا ہے۔ جہاں سے ہاتھی پر سوار ہو کر چند گھنٹوں کے لئے قلعہ میں آتا اور پھر واپس شالامار میں چلا جاتا ہے ؛

جلوس سال ششم سنہ ۱۰۷۳ھ میں عالمگیر پھر لاہور آیا۔ اور چند یوم قلعہ میں قیام کر کے ۲۵۔ رمضان کو کشمیر روانہ ہو گیا۔ جہاں سے ۷ صفر سنہ ۱۰۷۴ھ کو چار ماہ گیارہ روز کے بعد پھر مراجعت فرمائے قلعہ لاہور ہوا۔ اور کئی دن تک قیام پذیر رہا۔ اسی قلعہ میں شاہ عباس والیٔ ایران کے ایلچی کو سات لاکھ روپیہ کے تحائف شاہِ ایران کے لئے دیئے گئے۔ اور اپنے ایک معتمد کے ہاتھ اپنا دستخطی خط شاہِ ایران کے جواب میں ارسال کیا۔
عالمگیر نے قلعہ کی عمارتوں میں کچھ ایزادی بھی کی۔ گو وہ ایزادی شاہجہان اور جہانگیر کے زمانہ کی عمارتوں کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ البتہ اورنگ زیب کی چند یادگاریں جو قلعہ کی زینت و رونق کا باعث ہیں۔ قابل ذکر ہیں۔ ایک شاہی مسجد جو قلعہ کے سامنے ہی ہے۔ ایک سرائے اورنگ زیب کی جس کی نسبت لاہور کی تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ وہ اس عالیشان شاہی مسجد کے مشرق کی طرف ہے۔ اور بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن آج جس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ تیسری عمارت وہ ہے۔ جو بادشاہی مسجد اور قلعہ کے درمیان جنوب کی طرف دو منزلہ واقع ہے۔ اور جس کے عین درمیان روشنائی دروازہ ہے۔ یہ عمارت درحقیقت اُن

طلباء کے لئے جو بادشاہی مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ دار الاقامہ کا کام دیتی تھی۔ عالمگیر کے بعد شاہی خاندان کے لئے یہاں عرق وغیرہ نکالنے کا کارخانہ جاری ہوا۔ اور یہ عمارت آبدار خانہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ۱۷۹۹ء سے ۱۸۳۹ء تک اس عمارت کا نام گلاب خانہ مشہور رہا۔ یہاں عرق گلاب اور بید مشک نکالا جاتا تھا اور مہاراجہ کے لئے قیمتی معجونیں اور ادویات تیار ہوتی تھیں۔ انگریزی عہد میں یہ عمارت اسی کام کے لئے استعمال ہونے لگی۔ جس کام کے لئے اورنگ زیب نے اس کو تعمیر کرایا تھا۔ یعنی اب یہاں طلباء رہتے ہیں

عالمگیری عہد کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ گذشتہ سطور میں تم پڑھ چکے ہو۔ کہ اکبر کے زمانہ میں دریائے راوی قلعہ کی دیواروں کے نیچے بہتا تھا۔ اور چونکہ روز بروز اس کا رخ شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسلئے عالمگیر نے اپنے چوتھے سال جلوس میں دو کوس لمبا ایک بند دریا پر بنوا دیا۔ جس کا نام کتابوں میں بند عالمگیری درج ہے۔ اس سے دریا کا رخ شاہدرہ کی طرف چلا گیا۔ اور شہر نقصان سے بچ رہا۔ اب بھی اس بند کے آثار پائے جاتے ہیں۔

شاہ عالم بہادر شاہ:۔ ۲۸۔ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ کو عالمگیر نے دکن میں انتقال کیا۔ تقریباً سوا دو مہینے کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ نے بعمر اڑسٹھ سال صفر ۱۱۱۹ھ کو لاہور کے قلعہ میں خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اور اپنے دیوان منعم خاں کو وزارت کی مبارکباد دی۔ اسی قلعہ میں

لے پنجاب اور کابل شہزادوں کی جاگیر ہیں تھے۔ اور لاہور کا دیوان منعم خاں تھا۔ جسنے شہزادے کو عالمگیر کے مرنے کی خبر پہونچائی تھی۔ اور لاہور پہونچنے پر سلطنت و حکومت کی مبارکباد دی تھی۔

جہاں اکبر کے عہد میں فتوحات کے احکام جاری ہوتے ۔ علمی و مذہبی مباحثوں کی سرگرمیاں دماغوں کو روشن کرتیں ۔ جہاں جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں مغلیہ عمارات کے خوشنما نمونے دلوں پر رعب و سطوت پیدا کرتے تھے ۔ بہادر شاہ کے آخری عہد حکومت سنہ ۱۱۲۳ھ مطابق سنہ ۱۷۱۱ء میں کبھی تو یہ حکم ہوتا کہ تمام شہر کے کتے مروا دیئے جائیں ۔ کبھی ارشاد ہوتا ۔ علماء و صلحاء کو جہاں ملیں ان کو محبوس و بے عزت کرو ۔ ہندوؤں کو حکم ہوا ۔ کہ سب داڑھی منڈوا دیں ۔ جو رکھیگا وہ سزا کے قابل ہو گا ۔ آخر اسی قلعہ میں بہادر شاہ خفقان کی شدت سے ۱۹ ۔ محرم کو انتقال کر گیا ۔ اور لاش دہلی روانہ کی گئی ۔

اس کے بعد کسی مغل بادشاہ کو لاہور کا قلعہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا ۔ البتہ مغل گورنراں کی طرف سے لاہور میں حکومت کرتے رہے ۔ کامل اٹھاسی سال کے بعد سنہ ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا ۔ اور قلعہ میں اپنی رہائش اختیار کی ۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اسکے جانشین ۔ رنجیت سنگھ کی موت سے سولہ سال پیشتر سنہ ۱۸۲۲ء میں ولیم مور کرافٹ ایک انگریز سیاح لاہور آیا ۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں قلعہ اور ثمن برج کے جو حالات لکھے ہیں ۔ اُن کچھ خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔ ثمن برج کی کئی منزلیں ہیں ۔ اور اس کی دیواروں پر روغنی منقش کام خوب چمکتا ہے ۔ انسانوں اور حیوانوں کی لڑائیاں دیواروں پر ایک عجیب لطف دیتی ہیں ۔ اس عمارت کا بہت سا حصہ منہدم و مسمار ہو چکا تھا ۔ رنجیت سنگھ نے اس کی کچھ مرمت کرا دی ہے ۔ مگر سکھوں کو فن تعمیر کا وہ اعلےٰ مذاق

حاصل نہیں ہے۔ جو مغلوں کو تھا "دسہرہ اور بسنت کے تیوہاروں پر مہاراجہ کی سواری بڑے تزک و احتشام سے قلعہ سے نکلتی تھی۔ شاہجہانی عہد کی موتی مسجد میں مہاراجہ کے حکم سے خزانہ رکھا گیا۔ اور اس کا نام موتی مندر قرار پایا۔ اسی قلعہ میں مہاراجہ شیر سنگھ کا وزیر راجہ دھیان سنگھ دسمبر ۱۸۴۳ء) میں سندھانوالیوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اور اسی قلعہ پر مہاراجہ شیر سنگھ نے ۱۸۴۱ء میں رانی جنداں اور اس کی محصور ڈوگرا فوج پر بادشاہی مسجد کے میناروں کے ذریعہ توپوں کے فائر کئے۔ اسی قلعہ میں ۱۸۴۶ء میں دنیا کا مشہور کوہ نور ہیرا مہاراجہ دلیپ سنگھ نے لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کے سپرد کیا۔ اسی قلعہ سے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو نکال کر انگلستان اور رانی جنداں کو بدر کر کے قلعہ شیخوپورہ میں لے گئے۔

عہد سرکار انگریزی۔ ہاتھی پول دروازہ جو صرف حرم سرا کے لئے مخصوص تھا۔ بادشاہی عہد اور ناظمانِ لاہور اور سکھوں کے عہد میں بھی ہمیشہ بند رہا۔ لیکن انگریزوں نے شرقی اور غربی دونوں بڑے دروازے بند کر دیئے۔ قلعہ کی بے شمار شاہی عمارتیں گرا کر گوروں کے لئے بارکیں بنائی گئیں۔ شیش محل۔ موتی مسجد۔ تخت شاہی۔ دالان محاذ تخت۔ خوابگاہ کلاں و خورد۔ مکانات ثمن برج وغیرہ ابھی تک موجود ہیں سرکار انگریزی بھی ابتدائی ایام میں اپنا خزانہ موتی مسجد ہی میں رکھتی تھی۔ لیکن اب وہ مسجد واگذار ہے۔ قلعہ کی بالائی عمارت کے نیچے اکثر تہ خانے مغلیہ زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ثمن برج کے نیچے بڑا وسیع سرداخانہ ہے جہاں سرکاری شراب کا ذخیرہ بڑے پیمانہ پر جمع رہتا ہے۔

لاہور کا قلعہ ۱۸۴۹ء میں انگریزی فوج کے حوالے کیا گیا تھا۔ کامل

پچھتر سال کے بعد یہ قلعہ ۱۶ - جنوری ۱۹۲۴ء کو پھر سول حکام کے حوالہ کیا گیا - چنانچہ دس بجے کے قریب نارتھ سیٹن رجمنٹ قلعہ پولیس کے حوالے کر کے خود نئی بارکوں میں چلی گئی - اس تبدیلی کی کئی وجوہ بیان کی جاتی ہیں - ایک تو یہ کہ قلعہ مصر صحت جگہ میں واقع ہے - اور اس کے ساتھ چھوٹا راوی بہتا ہے - دوسری وجہ یہ ہے - کہ قلعہ چھاونی سے بہت دور ہے - تیسری وجہ یہ کہ قلعہ میں فوج کے لئے جگہ ہی کم ہے - قلعہ دیکھنے کے لئے صاحب ڈپٹی کمشنر کے پاس درخواست کرنی پڑتی ہے - قلعہ کی دیواروں اور اندرون قلعہ کی عمارات کی مرمت بھی ہوتی رہتی ہے - مگر بیرونی دیواریں اب پھر شکستہ اور مرمت طلب ہو رہی ہیں - یہ قلعہ بھی دیگر شاہی عمارات کی طرح محکمہ آثار قدیمہ کے ماتحت ہے ؂

تین پنجابی ہم مکتب

نظام الملک طوسی - عمر خیام نیشاپوری اور حسن بن صباح کا نام سب اہل علم جانتے ہیں ؎ یہ تینوں یگانۂ دہر ہستیاں ایک ہی مکتب میں ایک ہی اُستاد کے پاس زانوئے ادب تہ کرتی رہی ہیں - فارغ التحصیل ہونے کے بعد انتخاب روزگار مذاق طبیعت سے اور بقائے دوام کی خواہش سے نظام الملک کو خاندان سلجوق کی وزارت کا قلمدان سپرد کیا - عمر خیام نے فلسفیانہ شاعری میں وہ نام

ئه سلطان الپ ارسلان اور اُس کے بیٹے سلطان ملک شاہ کے جو فارس اور ما وراء النہر اور عراق و شام کے بادشاہ تھے - اور جن کے مقابلہ کا اُس زمانہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا ۲۹ سال تک وزیر رہے ہیں نظام الملک سنہ ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا - اور سنہ ۴۸۵ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے قتل ہو گیا - نیشاپور کا مدرسہ نظامیہ اسی کی یادگار ہے ؂

پیدا کیا۔ کہ ایران و ترکستان اور بغداد و افغانستان کے علاوہ ہندو یورپ میں
اس کے مداح پیدا ہو گئے۔ حسن بن صباح نے تو فرقۂ باطنیہ قائم کر کے نہ
صرف طاقت و ثروت حاصل کی۔ بلکہ وہ شاہانہ حیثیت قائم کر لی۔ کہ چار
نسلوں تک اس کی اولاد وسیع مملکت میں بادشاہی کرتی رہی۔

تاریخ ان تینوں نادر روزگار ہم مکتبوں کے عظیم الشان کارناموں سے
بھری ہوئی ہے۔ یہ تینوں ہم مکتب علمائے عصر میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔
علم و فضل میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ نظام الملک نے علوم و فنون کی
سرپرستی۔ اور اپنے قابل ہم جماعت و ہم مکتب عمر خیام کی وہ اعانت کی
ہے۔ کہ تاریخ کے اوراق ورق گل بن کر اس کے نام پر نثار ہو رہے ہیں۔

ایسے عدیم النظیر طالب علم جن میں شہرت و عظمت کے لحاظ سے
ایک وزرائے اسلام کے سلسلہ کی پیش کڑی ہو۔ ایک شاعری میں درجۂ
کمال رکھتا ہو۔ اور ایک عروج و اقبال کی انتہائی منزل پر پہونچ چکا ہو۔
ہر روز کہاں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مادرِ گیتی ایسے فرزند بار بار پیدا نہیں کرتی۔
اور نہ اس قسم کی مثالیں ہم کو صفحاتِ تاریخ میں کثرت سے نظر آ سکتی ہیں۔

لیکن یہ مشہور مثل کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ خواہ کتنے عرصہ
کے بعد دُہرائے۔ آخر کبھی کبھی اپنی صداقت دکھا جاتی ہے۔ چنانچہ ان تین
نادر طالب علموں کے قریباً ساڑھے پانچ سو سال بعد دسویں اور گیارہویں
صدی ہجری میں ہم کو تاریخ پھر تین جلیل القدر ہم مکتبوں کے نام بتاتی ہے
اس مرتبہ یہ ہم مکتب فارس و تاتار کی سرزمین میں نظر نہیں آتے۔ نہ ہم
انہیں نیشاپور۔ شیراز۔ بغداد۔ آذربائیجان۔ دیارِ ہند کے خطہ میں دیکھتے ہیں۔
بلکہ یہ تینوں ہم مکتب ہمیں ایسے شہر میں نظر آتے ہیں۔ جس کی زبان عربی

اور ایرانی زبانوں سے کسی صورت میں بھی نہیں ملتی۔ اور نہ یہ کبھی توقع ہو سکتی ہے۔ کہ ایسے ملک اور ایسے شہر میں عربی اور فارسی کے طالب علم ہی نہیں بلکہ علامہ ملک العلماء پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ تینوں ہم مکتب پنجاب میں پیدا ہوئے۔ یہیں پھلے پھولے۔ اور یہیں انہوں نے علم حاصل کیا۔ البتہ ان میں سے ایک دہلی میں پیوند خاک ہوا۔ اور وہ اپنے مسکنوں میں راہگذر عالم جاودانی ہوئے۔ ایک طالب علم کا نام ملک العلماء علامہ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی[1] ہے۔ دوسرے کا نام نواب سعداللہ خاں چنیوٹی ہے۔ تیسرے جلیل القدر طالب علم کا نام شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ہے۔ ان تینوں ہم مکتبوں نے لاہور و سیالکوٹ کے مدارس میں علامہ کمال کاشمیری سے حدیث و تفسیر منطق و فلسفہ اور علم کلام کی تعلیم اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔ جب دسویں صدی ہجری کو اپنی یک صد طویل منزلوں میں سے صرف دس بارہ منزلیں طے کرنی باقی رہ گئی تھیں۔ تینوں ہم مکتبوں نے لازوال شہرت حاصل کی ہے۔ نہ صرف تاریخوں میں بلکہ دلوں پر اور زبانوں پر ان ممتاز و برگزیدہ ہستیوں کے علمی۔ ملکی اور دینی کارناموں کا ذکر ہے۔

مولوی عبدالحکیم اکبر کے عہد میں لاہور کی سرکاری درسگاہ کے مدرس اعلیٰ (پرنسپل) مقرر ہوتے ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں ان کو جاگیر بطور مدد معاش ملتی ہے۔ اور بادشاہ کی مصاحبت کی عزت حاصل ہوتی ہے۔ شاہجہان کے زمانہ میں علامہ ممدوح دو مرتبہ ہموزن روپیہ کے ساتھ تولے جاتے ہیں۔ اور ان کی جاگیر رفتہ رفتہ سوا لاکھ روپیہ سالانہ تک پہونچا دی جاتی ہے۔ آپ کے

[1] ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی سوانح عمری علیحدہ چھپ چکی ہے قیمت ۱۲/

دم قدم سے سیالکوٹ میں علوم و فنون کی وہ رونق اور درسگاہ عبد الحکیمیہ میں تشنگان علم کی وہ بھیڑ ہوتی ہے۔ کہ سیالکوٹ پر ایک علمی یونیورسٹی ہونیکا شبہ ہوتا ہے۔ مولوی عبد الحکیم ۱۰۶۸ھ میں ٹھیک اسی سال جب اُن کے حقیقی قدردان و مربی شاہجہان کو اُس کے بیٹے عالمگیر نے نظر بند کیا ہے۔ اپنے وطن سیالکوٹ میں انتقال کر جاتے ہیں۔

ملک العلماء عبد الحکیم کی تصانیف زیادہ تر علم منطق، فلسفہ اور کلام میں مشہور ہیں۔ انہوں نے منطق و کلام کی کتابوں پر بسیط حواشی لکھے ہیں ان کی تصانیف نہ صرف ہندوستان کی علمی درسگاہوں میں بلکہ مراکش و بخارا۔ کابل و قسطنطنیہ اور مصر و شام تک طلبا کو پڑھائی جاتی ہیں۔ نہ صرف سیالکوٹ اور پنجاب بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس جید عالم کی مبارک ذات پر فخر ہے۔

ان کا دوسرا اہم مکتب سعد اللہ خاں چنیوٹ کا رہنے والا ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ لاہور اور سیالکوٹ میں علامہ کمال کاشمیری کی درسگاہوں میں دن کو آفتاب کی روشنی میں اور رات کو مٹی کے چراغ میں سرسوں کا نہیں بلکہ آنکھوں کا تیل جلا کر علم کی پیاس بجھاتا تھا۔

بعض تذکروں اور تاریخوں میں درج ہے۔ کہ علمائے عصر میں ملا سعد اللہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کسی سے کم نہ تھا۔ ۱۰۴۵ھ کے قریب جب شاہجہان تک اس کی قابلیت کی شہرت پہونچی۔ تو اس نے سعد اللہ کو بلایا۔ لیکن جب اسے تنخواہ حسب خواہش نہ ملی۔ تو بادشاہ کی ناراضگی کی کچھ پرواہ نہ کرکے واپس چلا آیا۔ بادشاہ پر اس کی قابلیت و علمیت نقش ہو چکی تھی۔ اس لئے ۱۰۵۰ھ میں پھر یاد کیا۔ اور اسے معقول مشاہرہ دیا۔ چار ہی سال کے

اندر یعنی ۱۰۵۰ھ میں ملا سعد اللہ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم صاحبقران ثانی کے نام سے مخاطب ہونے لگا۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب ملا۔ اور اس کے بعد روز بروز اعزاز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شاہزادہ دارا شکوہ جو شاہجہان کا لاڈلہ بیٹا اور اُس کا ولیعہد تھا۔ اس سے خم کھاتا تھا۔

سعد اللہ خاں نے لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑ کر ۱۰۶۶ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔

مولانا عبد الحکیم کے تیسرے جلیل القدر اور لاثانی ہم مکتب حضرت شیخ احمدؒ سرہندی تھے۔ جو زمانہ اکبر ۹۷۱ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ نے فارغ التحصیل ہوکر ابوالفضل اور فیضی سے آگرہ میں جاکر طویل اور زبردست بحثیں کی ہیں۔ یہ دونو بھائی جن میں ایک اکبر کا وزیر اور دوسرا دربار کا ملک الشعرا تھا۔ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ابوالفضل اور فیضی مذہبی لحاظ سے بالکل آزاد منش تھے۔ بلکہ اکبر کو لامذہبی کی چاٹ بھی انہی دونوں بھائیوں نے لگائی تھی۔ اس لئے علمائے اسلام اور خصوصاً امام غزالیؒ کو یہ دونوں بھائی بہت بُرا سمجھتے تھے۔ علمائے دربار اپنی مصلحتوں کیوجہ سے خاموش تھے۔ مگر حضرت شیخ احمدؒ سرہندی بادشاہ اور وزیر دونوں کے عیوب و نقائص برملا ظاہر کرتے تھے۔ جہانگیر کے زمانہ میں آپ کے پاس ارادتمندوں اور حق کے طالبوں کا ایک جم غفیر رہتا تھا۔ حاسدوں نے آپ کے خیالات کو اُلٹ پلٹ کر بادشاہ کے روبرو ایسے الفاظ میں بیان کیا۔ کہ بادشاہ ان سے بدظن ہوگیا۔ اور ان کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد نہ صرف اُن کو رہا کر دیا۔ بلکہ معافی مانگی۔ اور شہنشاہ کے ارشاد کے مطابق احیائے سنت کے احکام جاری کئے۔ علامہ

عبدالحکیم نے آپ کو نہ صرف مجدد الف ثانی کا خطاب دیا بلکہ حضرت کی بیعت بھی کی۔ سنہ ۱۰۳۴ھ میں آپ انتقال فرما گئے۔ آپ شہرت و عظمت کے لحاظ سے اپنے دونوں جلیل القدر ہم مکتبوں سے بڑھ گئے ہیں۔ آپ کی زندگی ہی میں اکثر شاہزادے بلکہ بیرونی ممالک کے بادشاہ بھی آپ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے تھے۔ طریقہ مجددیہ احمدیہ جو اتباع شریعت و احیائے سنت کے لحاظ سے صوفیائے کرام کے تمام سلسلوں سے افضل و برتر ہے۔ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کا روضہ سرہند میں مرجع خلائق ہے۔
جس طرح اہل سلجوقیہ کے تینوں عظیم القدر ہم مکتب آسمان شہرت پر روشن ستارے بن کر چمکے ہیں۔ اسی طرح عہد مغلیہ کے یہ تینوں رفیع المنزلت ہم مکتب بقائے دوام کا خلعت حاصل کر کے زبان خاموش سے کہہ رہے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نورجہاں کی آخری خوابگاہ

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

نورجہاں کو جانتے ہو۔ کس جنگل بیابان کس زمانہ مصیبت افزا اور کس پریشان حالی و غریب الوطنی میں پیدا ہوئی۔ پھر کہاں پرورش پائی اور کس طرح پھلی پھولی۔ وہ باپ جس کو اس عالم میں اس کی پیدائش بارگراں معلوم ہوئی تھی۔ آخر اسی کی بدولت اعتماد الدولہ اور "دیوان بیوتات" ہوا۔ وہ مال

جس نے پیدا ہوتے ہی اپنی چھاتی سے الگ کر کے لوہے کا دل کر لیا تھا۔ اسی سنگِ پارس اور اسی لعل بے بہا کی بدولت جواہرات اور ہیروں کی مالک ہو گئی۔

پھر یہ بھی جانتے ہو۔ وہ جنگل کی پیدائش کس طرح مہر النسا سے نور محل اور نور محل سے نور جہاں اور آخر میں جہانگیر یعنی سلطنت کی مختار کل بن گئی۔ کیسے کیسے جلیل القدر امراء بلکہ امیر الامراء اس کی سرکار کے ادنےٰ غلام تھے۔ کتنے شعراء اور اہلِ علم تھے۔ جو اُس کے دامن سے لپٹے رہتے تھے۔ کیسی کیسی عالیشان عمارتیں اس کے حکم اور اس کی تحریک سے دہلی۔ آگرہ۔ لاہور کشمیر اور کابل میں تعمیر ہوئیں۔ کس قدر مقبرے اور مزار اس نے مرمت اور تعمیر کرائے۔ آؤ آج تمہیں بتائیں۔ اس کی اپنی آخری خوابگاہ کس حال میں ہے

نور جہاں لاہور میں جہاں وہ اپنے خاوند[1] کی وفات کے بعد مرتے دم تک اقامت گزیں رہی۔ ۲۹۔ شوال ۱۰۵۵ھ کو انتقال کر گئی۔ اور اپنے بھائی یمین الدولہ آصف جاہ[2] کے مقبرہ کے پہلو میں دفن ہوئی۔ مزار نور جہاں کی جو کیفیت ظفر نامہ شاہجہان[3] میں شاہجہان نامہ کے حوالہ سے درج ہے۔ پہلے اس کو بالاختصار لکھتا ہوں۔ پھر سلطنت کے انقلاب کے

---

[1] جہانگیر وفات ۱۰۳۷ھ [2] وفات ۱۰۵۱ھ شاہجہان کا وزیر تھا [3] تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ کی جلد ہفتم مطبوعہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۲۲۸ و ۲۲۷ [4] اس کا نام عمل صالح بھی ہے۔ مصنف محمد صالح کمبوہ مسکن و مدفن لاہور۔ اس کی تعمیر کردہ ایک مسجد موچی دروازہ لاہور میں اب تک موجود ہے۔ یہ مصنف جہانگیر کے زمانہ سے لیکر عالمگیر کی ابتدائی حکومت تک زندہ رہا ہے۔ شاہجہان نامہ میں شاہجہان کا حال پیدائش سے وفات تک مفصل درج ہے۔ نور جہاں نے محمد صالح کی زندگی ہی میں وفات پائی ہے +

بعد زمانہ کے بے درد ہاتھوں اور نااہل حکمرانوں کی سنگدلی و شقاوت قلبی نے ملکۂ ہند کی سلطنت کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اس کا کچھ ذکر کرو نگار ظفر نامہ میں لکھا ہے "یہ مقبرہ روضۂ جہانگیر کے جلوہ خانہ کے غرب میں واقع ہے۔ اس کا گنبد سطح سے بلندی تک مثمن ہے۔ قطر اس کا پندرہ گز۔ اضلاع ہشتگانہ۔ اندر کی طرف آٹھ نشیمن اور باہر کی طرف آٹھ پیش طاق۔ ہر طاق طول میں سات عرض میں چار اور ارتفاع میں گیارہ گز۔ بطرز نیم مثمن۔ عمارت کے اندر سنگ مرمر کا فرش اور باہر سنگ ابری سنگ مرمر۔ سنگ زرد اور طرح طرح کے قیمتی پتھر لگے ہوئے ہیں۔

مقبرہ کے بلند چبوترہ اور قبر کی اندر کی عمارت میں انواع و اقسام کے رنگین پتھروں سے پرچین کاری کی گئی ہے۔ آیات قرآنی اور اسمائے الٰہی بطریق پرچین کاری اس میں منقش ہیں۔ عمارت کے اندر جو فرش ہے۔ اس میں قسم قسم کے خوبصورت پتھر گرہ بندی کر کے لگائے گئے ہیں۔ گنبد کے گرد جو مثمن چبوترہ ہے۔ اس کا قطر ساٹھ گز ہے۔ اور وہ سرتا پا سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا طول نو اور عرض ساڑھے سات گز ہے۔ یہ مقبرہ نور جہاں نے اپنی حین حیات ہی میں بنوالیا تھا[1]۔ مقبرہ کے چاروں طرف باغات ہیں۔ اور ان کو

[1] تاریخ محمد شاہی میں جس کا دوسرا نام تاریخ نادر الزمانی ہے سنہ ۱۰۵۵ھ کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "دریں تاریخ نور جہاں بیگم از تنگنائے عالم فانی رحلت نمودہ در مقبرہ کہ پہلوئے مرقد یمین الدولہ در حین حیات خود بنا نہادہ بود مدفون گشت" صفحہ ۱۹۲۔ یہ تاریخ منشی خوشحالچند سامی کی تصنیف ہے۔ جو فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ میں دبیر الانشاء رہا ہے۔ تاریخ ابھی تک (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵ پر)

"چار چمن" کہتے ہیں۔ چنانچہ چار چمن کے عین وسط میں یہ مقبرہ ہے۔ ہر چمن کا طول و عرض سو سو گز ہے۔ مقبرہ کی شرقی دیوار روضۂ جہانگیر سے مشترک ہے۔ اس مقبرہ کے ضلع غربی میں ایک مسجد ہے۔ اور اس کے شرق میں ایک ایسی خوبصورت عمارت ہے۔ جو مسجد تو نہیں ہے لیکن بالکل مسجد کی طرز پر بنی ہوئی ہے باغ کے جنوب کی سمت ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ یہ تمام عمارت خود نورجہاں نے تین لاکھ روپیہ کی لاگت اور چار سال کی طویل مدت میں تعمیر کرائی تھی۔

نورجہاں نے روح کے اس خلوت کدہ اور لاش کی اس آرامگاہ کو گنج عافیت سمجھ کر تعمیر کرایا تھا۔ اور زبانِ حال سے اس کو خطاب کر کے کہا تھا

اے لحد اے قبر اے خلوت گہِ روحِ رواں　　زلیست کی واماندگی کا ایک گہوارہ ہے تو
تیرے ہر گوشہ میں ہیں موجود سامانِ اماں　　منظرِ ہستی کا اک خاموش نظارہ ہے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴) غیر مطبوعہ اور قلمی ہے۔ اور پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے اس تاریخ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نورجہاں نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا سلہ تحقیقات چشتی کا مصنف جس نے سکھ سلطنت کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے صفحہ ۹۷۷ پر لکھتا ہے۔ اس مقبرہ کے نواح میں بہت بڑا باغ تھا۔ اب وہاں زراعت ہوتی ہے۔ یہ ۱۸۴۴ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے۔ آج ۱۹۲۳ء میں زراعت کا نام بھی نہیں ہے۔ نشیب و فراز زمین ہے اور کھجوروں کے چند درخت ہیں سلہ یہ غالباً وہ دیوار ہے جو مقبرہ آصف جاہ کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقبرہ نورجہاں کی حدود کتنی وسیع تھیں سلہ اس دروازہ کا کہیں نام بھی نہیں ہے بلکہ مقبرہ کے گرد کوئی چار دیواری ہی نہیں ہے۔ اور یہ بات کبھی ذہن نشین نہیں آ سکتی ہے۔ کہ اس مقبرہ کا کوئی عالیشان دروازہ تھا۔

کہتے ہیں" ہیچ آفتے نرسد گوشہ تنہائی را" لیکن یہ علم و فضل کی ملکہ یہ حُسن و زینت کی کان جو مُلکی و علمی دانشوری کا تاج پہنے شاہ و امراء تو کیا "شہنشاہ" کے دل پر حکمران تھی۔ گوشۂ تنہائی میں رہنے کے باوجود بھی آفتوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ کفن چور اور مزار شکن نامرد لٹیرے حاکموں نے اس کی لوحِ مزار تک بھی اُڑا لی۔ جہاں سنگ مرمر اور سنگ ابری کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ جہاں گل و گلزار کی بہار تھی۔ وہاں سنگ و خشت کا ڈھیر ہے اور خشک سخت اور ناہموار خاک چاروں طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ سیّاح آتے ہیں۔ مقبرہ کی عبرتناک حالت اور باغ کو بے نام و نشان دیکھ کر حسرت بھرے دل سے کہتے ہیں ؎

تیری حالت سے نمایاں ہو پریشانی تری — کیا کسی ناشاد کا برباد گشتہ دل ہے تو
منظرِ عبرت ہے یہ خاموش ویرانی تری — عالمِ فانی کی اک اُجڑی ہوئی محفل ہے تو

جب تک شاہی حکومت رہی۔ اسلامی عمارات اور مغلیہ یادگاروں کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ مگر جب شاہانِ دہلی کی غفلتوں وزرائے دربار کی خودغرضیوں بالخصوص نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں نے سلطنتِ مغلیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ تو لٹیروں اور ڈاکوؤں نے جھاڑیوں اور جنگلوں سے سر نکالا۔ اور نہ صرف حکومت ہی کو پامال کیا۔ بلکہ ان سورماؤں نے اسلامی عمارتوں مسجدوں، مقبروں اور باغوں کو تہس نہس کر دیا۔ اور انہی میں ملکۂ ہند نورجہاں کا مزار بھی تھا۔ جس کی عظمت و سطوت کا سکہ آج بھی تاریخ ہند کے صفحات پر موجود ہے۔ اور جو راوی کے کنارے ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری

(۱) بعہد جھنڈا کلاں سنہ ۱۷۵۸ء و بعہد سہ حاکمان لاہور سنہ ۱۷۶۵ء و بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بعد از سنہ ۱۸۰۵ء تا اختتام حکومت سکھاں۔

نیچے موت کے ساتھ گلے مل کر سو رہی ہے ؂

۱۹۰۵ء سے پیشتر راقم الحروف نے اس مقبرہ حسرت نما کی جو حالت
دیکھی ہے۔ اس کی عبرت انگیز کیفیت سے انسان تو انسان صحرا بھی حسرتناک
ہو جاتا تھا۔ جن باتوں کا ذکر ۱۰۵۵ھ کا مصنف (محمد صالح کمبوہ مصنف
شاہجہان نامہ) اپنی تاریخ میں بڑے پُر شکوہ الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ ۱۳۲۳ھ
میں خواب و خیال نظر آتی ہیں۔ مقبرہ کے زرّین اور مینا کار کمرے۔ چار چمن
اُس کی کھٹی اور پُر بہار روشیں۔ لوحِ مزار اور اُس پر آیاتِ قرآنی اور اسمائے
الٰہی۔ سنگِ مرمر اور سنگِ ابری کے فرش اور ان کے درمیان انواع و اقسام
کے پتھروں کی گرہ بندیاں۔ پچی کاری کے نقش۔ حوض۔ فوارے۔ باغ اور مقبرہ
کا دروازہ غرض کسی چیز کا نشان کیا نام بھی نہیں ہے ؂

جس مقبرہ اور باغ کی دیواریں روضۂ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ کے ساتھ
مشترک تھیں۔ اور جن کے کچھ نہ کچھ آثار تلاش کرنے سے اُس وقت بھی مل
سکتے تھے۔ ۱۸۶۰ء کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ریلوے لائن نے اُس
مقبرہ کو بھائی اور خاوند کے مقبروں سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ اب وہ ہے اور
عالمِ تنہائی۔ چراغِ گور کی بجائے کرمکِ شب تاب کبھی کبھی اپنی چمک دمک دکھا
جاتا ہے۔ پھول چڑھانے والے کہاں! امواجِ ہوا گلِ افسردہ کا پتہ کبھی کبھی
اُڑتے اُڑاتے لے آتی ہے۔ اور اس پر بھی دہنِ گور سے آواز آتی ہے ؎

[1] لاہور میں سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں ریلوے کارخانہ بنا۔ اور ۱۸۶۲ء
میں لاہور سے امرتسر تک ریل جاری ہوئی۔ اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے
بعد پشاور لائن تیار ہوئی۔ جس پر نورجہاں کا مقبرہ لاہور سے ۶ میل کے فاصلہ
پر واقع ہے ؂

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما | بس نازک است شیشۂ دل در کنار ما

بعہد لارڈ کرزن ۱۹۰۵ء میں یا اس سے ایک دو سال پیشتر مہاراجہ بردوان کہ ان کے آبا و اجداد کا اصل وطن لاہور ہی ہے۔ لاہور آئے۔ اور شالامار باغ اور عمارات شاہی کے بعد ملکۂ ہند کے پُر حسرت مزار پر جب ایک نظر ڈالی تو دل پکڑ کر رہ گئے۔ گورنمنٹ پنجاب کو اس طرف توجہ دلائی اور مرمت کے لئے پانچ ہزار روپیہ اپنی گرہ سے بھی دیا۔ چنانچہ اب یہ عمارت گورنمنٹ کے محکمہ آثار قدیمہ میں داخل ہے۔ مقبرہ کے گرد تاروں کا ایک جنگلہ ہے۔ اور چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سرسبز و شاداب روشیں بنا کر چار چمن کی یاد تازہ کر دی گئی ہے۔ نو دو سو نام اور آیات قرآنی تو لوح مزار پر نہیں لکھے جا سکے۔ لیکن قبر کا تعویذ اور چبوترہ سنگ مرمر کا بنا دیا گیا ہے۔ اس چبوترہ پر دو قبریں ہیں۔ ایک ملکۂ ہند نور جہاں کی اور ایک اس کی بیٹی کی جو شہریار کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ قبر ملکہ کے پاس ہی مشرقی دیوار کے ساتھ حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی کی طرف سے سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے۔ جس پہ ذیل کی عبارت مع نور جہاں کی وفات کے قطعہ تاریخ کے درج ہے۔

پس از نزاع دو ہشت سال شد یک جا | روان مہر النساء بیگم و ملک بہ جناں
بہ یاد بانوئے ہندوستاں سروشم گفت | سنین ہجرت و تاریخ عیسوی تواماں
ہزار و پنجہ و پنج رفتہ از ہجرت | ملے بہ بہشت جہانگیر رفتہ نور جہاں

{ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں در ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء
ایں لوح را نصب کردند }

جنوب کی طرف ایک تہ خانہ ہے۔ جس میں ایک تو سیڑھیاں اور راستہ

نیچے جانے کا ہے۔ اور شمال جنوب اور مشرق کی طرف سے جالیوں کے ذریعہ بیرونی سطح سے روشنی آتی ہے۔ اصل قبریں اسی تہ خانہ کے اندر تھیں۔ جب آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر اُتارا گیا۔ تو بیدردوں نے عورت زاد کے مقبرہ کی طرف بھی رُخ کیا۔ سنگِ مرمر۔ سنگ سرخ۔ سنگ ابری سب اُتار لیا۔ تہ خانہ کا دروازہ بند رہتا تھا۔ اس کو بھی کسی دفینہ کی تلاش کے لئے توڑ ڈالا۔ وہاں کیا تھا۔ دو آبنوسی صندوق ماں بیٹیوں کی لاشوں کو چھاتیوں سے لگائے ہوئے سنگین لحدوں میں محفوظ تھے۔ ظالموں نے صندوقوں کو باہر نکالا۔ پتھروں کو اُکھیڑ لیا۔ اور پھر صندوقوں کو زمین میں دفن کرکے اوپر سے سطح برابر کر دی اور تہ خانہ کا دروازہ جس کو توڑ ڈالا تھا۔ وہ بھی تعمیر نہ کیا۔

مہاراجہ بردوان کی حب الوطنی سرکار کی توجہ اور نگرانی اور حاذق الملک بہادر کی نیک یادگار سے مقبرہ کی وہ ذلت و رسوائی اب نہیں ہے۔ جو ۱۹۰۵ء سے پیشتر تھی۔ اب نگرانی و حفاظت اور مزار ملکۂ ہند کی جاروب کشی کے لئے ایک سرکاری آدمی موجود رہتا ہے۔

مقبرۂ نورجہاں کے متصل ہی برلبِ سڑک مغرب کی جانب تھانہ شاہدرہ کے پاس تحصیل شاہدرہ کی عمارت بھی بن گئی ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ اور جن کو معلوم ہے۔ کہ اس بارہ دری میں ملکۂ ہند دفن ہے۔ وہ اس آسودۂ آغوش راوی کو خطاب کرکے کہتے ہیں ؎

ہے نازاں ہند تجھ پر نازشِ ہندوستان تو ہے
نہیں کچھ ہند ہی پر منحصر نورجہاں تو ہے
جہاں اک پیکرِ بے جاں ہے اس پیکر میں جاں تو ہے
جہاں اک آسماں ہے آفتابِ آسماں تو ہے

ترا مہر تجلّے نور بخش چشم انجم ہے
ترا دربارِ حسن اک محشرستانِ تلاطم ہے
لگی ہے چپ تجھے لیکن زبانِ حال گویا ہے
تری خاموشیٔ مرقد میں بھی اک بات پیدا ہے
تو زیرِ خاک ہو کر بھی زیارت گاہ دنیا ہے
شکستہ قبر تیری کعبۂ چشمِ تماشا ہے
زمینِ شاہدرہ تو ہے حریفِ چرخ مینائی
کہ تجھ میں دفن ہے ہندوستاں کی کشور آرائی

بُدھو کا آوا و مقبرہ

بُدھو کا آوا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اینٹوں کے بنانے اور پکانے کا ایک کارخانہ یا بھٹہ تھا۔ لیکن تاریخ لاہور میں اس پزاوہ یا آوا کو بہت عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ اور بانیٔ پزاوہ بُدھو کے مقبرے کی شاہجہانی عمارت نے اس کو بہت شہرت دے رکھی ہے

عہدِ حاضرہ میں آوا چونکہ مٹ مٹا کر ایک صاف میدان ہو گیا ہے۔ جہاں مسلمانوں اور عیسائیوں نے اب وسیع قبرستان بنائے ہیں۔ اس لئے بطورِ یادگار اس کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ پزاوہ لاہور سے مشرق کی جانب تین میل کے فاصلہ پر لبِ سڑک شالامار باغ واقع ہے۔ عہدِ جہانگیری میں سدھو نام کا ایک کمہار گذرا ہے۔ اس زمانہ میں امراء وزراء اور بڑے بڑے لوگ بیرونِ لاہور عالیشان

عمارتیں اور باغات تعمیر کیا کرتے تھے۔ بدھو نے اسی مقام پر جہاں بدھو کے آوے کو شہرت رہی ہے۔ چھوٹا سا پژاوہ تیار کیا۔ اور اینٹیں پکانے کا کام کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا کام یہاں تک بڑھا۔ کہ بقولِ صاحب تحقیقات چشتی وہ اپنے وقت کا میاں سلطان[1] بن گیا۔

بدھو اسی کا بیٹا تھا۔ شاہجہان نے جب شالا باغ کے تعمیر کرانے کا ارادہ کیا۔ تو نواب علی مردان خاں اور خلیل اللہ خاں نے بدھو کو اینٹوں کا ٹھیکہ دیدیا۔ اس ٹھیکہ اور سرکاری کام کی کثرت اور حکام کی عنایات سے بدھو کا نام سرکاری کاغذات میں "شاہی خشت پز" لکھا جاتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ حضرت میاں میر کے ایک درویش دل ریش سردی اور بارش کی وجہ سے اس پژاوہ پر آنکلے۔ بدھو کے ملازموں نے اس درویش کی حالت دیکھ کر اس سے استہزاء بھی کیا۔ اور اس کو ٹھہرنے کے لئے جگہ بھی نہ دی۔ بدھو کی عقل پر بھی شاہی خشت پز ہونے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے بھی طیش میں آکر کہا۔ اس پاگل کو جوتے مار کر نکال دو۔ اس کے ملازمانِ بد اندیش نے فوراً تعمیل کی۔ اور وہ درویش سینہ ریش شدّت بارش

---

[1] میاں محمد سلطان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں کشمیر سے لاہور آیا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانہ میں وہ ایک عمدہ پہلوان تھا۔ پھر اُس نے کئی کام شروع کیے۔ اور سب میں ترقی کرتا گیا۔ انگریزوں کے عہد میں اس نے بہت سی پرانی عمارتوں کی اینٹیں نکالی اور فروخت کی ہیں۔ وہ بہت بڑا رئیس اور ٹھیکیدار تھا۔ اس کی تعمیرات میں سرائے محمد سلطان حویلی میاں سلطان۔ لنڈا بازار اور کئی مسجدیں اور مقبرے ابھی تک موجود ہیں۔ قریباً پچاس سال سے اس کا انتقال ہو چکا ہے۔

ہی ناہیں یہاں سے نکال دیا گیا۔

اُدھر خدا کی قدرت کا ظہور اس طرح ہوا۔ کہ خس و خاشاک اور کوڑا کرکٹ کے ہزار لعل من صرف ہو گئے۔ مگر اینٹیں پختہ ہونے میں نہ آئیں۔ بدھو اسی غم میں بیمار ہو گیا۔ رات کو اس نے اپنے باپ سدھو کو خواب میں دیکھا جو غم و غصہ کی حالت میں اس کو کہہ رہا تھا۔ اگر تو اپنی بہتری چاہتا ہے۔ تو اس فقیر سے اپنی تقصیر معاف کرا۔

بدھو نے تلاش شروع کی۔ آخر معلوم ہوا۔ کہ وہ حضرت بیا بیر کے سلسلہ کے عبدالحق نام ایک درویش ہیں۔ ان کے پاس پہنچا۔ پاؤں پر گر پڑا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا۔ حقیقی فقرا تو وہ لوگ ہیں۔ جنکی نسبت ذیل کا شعر صادق آتا ہے ؎

بدلے گالی کے دعائیں فقرا دیتے ہیں
ہائے یہ لوگ بھی کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں ؎ ذوقؔ

فرمایا جاؤ خدا نے چاہا تو تمہاری نیم پختہ اینٹیں بھی پختہ اینٹوں کے نرخ پر فروخت ہو جائینگی۔ چنانچہ انہی دنوں میں جلد ایک امیر کبیر آدمی نے اپنی تعمیرات کا کام شروع کر دیا۔ اور بدھو کی تمام اینٹیں فروخت ہو گئیں ؎[1]

بدھو نے فقیر عبدالحق کا روضہ ان کے انتقال (۱۰۸۲ھ) کے بعد بعہد عالمگیر گنبد بہادر خاں کے شمال کیطرف تعمیر کرایا۔ بدھو کا اپنا مقبرہ بھی اسی جگہ برلب سڑک شالامار باغ ریلوے جنرل سٹور کی شمالی دیوار کے پاس واقعہ ہے۔

[1] تحقیقات چشتی صفحہ ۶۲۱

تیرہ چودہ سال سے ریلوے جنرل سٹور کی وسیع و طویل عمارت لے جو کئی میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور مغلپورہ کے جدید ریلوے سٹیشن نے بہت سی شاہجہانی طرز کی عمارتیں اپنے احاطہ میں لے لی ہیں۔ انہی میں گنبد بہادر خاں اور ڈیوڑھی مقبرہ نواب علی مردان خاں بھی ہیں۔ لیکن بدھو کا مزار اس سٹور کی دسترس سے بچ رہا ہے۔ یہ شاہجہانی عہد کا گنبد دور ہی سے نظر آتا ہے اس پر کسی قطعہ تاریخ یا صاحب مزار کے نام کا اندراج نہیں ہے۔ تاریخوں نے اس مقبرے اور اس کے گرد و نواح کے جو آثار بتائے یا ان سے پتہ چلا۔ یا ان لوگوں سے جو ان اطراف میں رہتے ہیں۔ مثلاً قبرستان بدھو کا آوا کے گورکن اور حضرت ایشاں کے روضہ کے لوگ۔ گنبد کی شمالی محراب پر ایک تختی صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور کی طرف سے اس مضمون کی چسپاں ہے۔ جس پر ۲۳ اگست ۱۹۱۸ء کا تحریر شدہ یہ حکم درج ہے "اس مقبرہ کو خراب کرنے والے کے ساتھ قانونی سلوک کیا جائیگا۔ جرمانہ یا قید یا دونوں سزائیں دیجائینگی"

اس منقش چینی کار گنبد کے اندر دو قبریں ہیں۔ مشرقی جانب کی قبر ذرا بلند ہے اور مغربی جانب کی چھوٹی ہے۔ رنگین پچیکاری کا کام گو بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ تاہم اس کی پامالی و خستہ حالی میں اس کی عظمت گذشتہ نظر آ رہی ہے۔ چاروں محرابوں پر جو کھلی رہتی ہیں۔ اس اعلیٰ کاریگری کے نشان اب تک پائے جاتے ہیں۔ جو کاسنی اور گلابی خطوط کی لکیروں اور ان رنگوں کے بیل بوٹوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ مقبرہ کا بیرونی شکستہ چبوترہ چاروں طرف سے پندرہ پندرہ قدم لمبا ہے۔ مقبرہ کے دریچوں کے اوپر جو عمارت چاروں طرف بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بالکل گر گئی ہے۔ مقبرہ

سا آٹھ (کرینہ کے) درختوں میں گھرا ہوا ہے ۔ جو اس کے شکستہ چبوترہ پر اُگے ہوئے ہیں ۔ اس گنبد سے قریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلہ پر مشرق کی طرف ایک پرانا کنواں شکستہ و تباہ حالت میں موجود ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبرہ کے گرد بہت کھلی جگہ تھی ۔ مقبرہ کا قدیم دروازہ سوٹک شالا باغ کے رُخ پر ہے ۔ چنانچہ ایک طویل چبوترہ کے نشانات اب تک نظر آرہے ہیں ۔

عالمگیر کے زمانہ میں لاہور میں امرا وزرا نے بہت کم عمارتیں تعمیر کرائی ہیں ۔ اور خود عالمگیر کی عمر کا زیادہ حصہ بھی دکن اور دارالسلطنت کی طرف ہی بسر ہوا ہے ۔ اس لئے گو بدھو کے آوے کی بلندی و رفعت چرخ چہارم تک پہنچ چکی تھی ۔ اور کاروبار کی وجہ سے یہاں کئی لوگوں نے معمولی سی ایک بستی بھی بنا رکھی تھی ۔ مگر جب سلطنت کو جو بدھو کی سرپرست تھی زوال آنے لگا ۔ اور چاروں طرف سے لوٹ مار ہونے لگی ۔ تو آوا روز بروز ویران ہونے لگا ۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ ۱۷۹۸ء تا ۱۸۳۹ء میں اس ویران پژاوہ کا نام پھر تاریخوں میں نظر سے گذرتا ہے ۔ مہاراجہ کے یوروشین ملازموں میں جنرل اومی ٹیبلی جسے پنجابی "اومی طوبیلہ صاحب" کہتے تھے ۔ ایک لائق اور ہوشیار اٹالین افسر تھا ۔ وہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے پس و پیش لاہور آیا تھا ۔ اور مہاراجہ نے ملکی صیغہ کے بعض اہم امورات اس کے سپرد کئے تھے پژاوہ بدھو کی بلندی تین تین منزل یعنی ۳۲-۳۳ فٹ تک تو راقم الحروف نے بھی دیکھی ہے ۔ اُس زمانہ میں تو یہ اس سے بھی بلند ہوگا ۔ پژاوہ کی چوٹی پر جنرل اومی طوبیلہ نے ایک عالیشان شاہانہ طرز کی کوٹھی تعمیر کرائی ۔

جسے لوگ عام طور پر بارہ دری کہتے تھے۔ کوٹھی کے ارد گرد دور دور تک جگہ صفا کرائی۔ اور اس کو بیل بوٹوں سے سجا کر چھوٹا شملہ بنا دیا۔ اس مقام پر سپاہ کے پنچ صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اور یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔ اس زمانہ میں اپنی بلندی اور گل و گلزار کی وجہ سے یہ مقام فرحت بخش تصور کیا جاتا تھا[۱]۔

جنوری سنہ ۱۸۴۳ء میں جب شہزادہ شیر سنگھ راجہ دھیان سنگھ کے ایما پر اپنی جاگیر بٹالہ سے لاہور آیا۔ تو ۱۴۔ جنوری سنہ ۱۸۴۳ء[۲] کو اسی کوٹھی میں مع اپنے مصاحبین کے اس نے قیام کیا۔ اسی جگہ کل پنچ اور فوج کے افسر جمع ہوئے اسی مقام پر شہزادہ کو پنجاب کا مہاراجہ تسلیم کیا گیا۔ اسی ٹیلہ کے نیچے توپوں کی سلامی سے اہل شہر اور اہل قلعہ کو شیر سنگھ کے مہاراجہ ہونے کی خبر پہنچی۔ اور اسی کوٹھی سے نکل کر مہاراجہ نے رانی جنداں کا قلعہ میں محاصرہ کیا۔ اور آخر فتحیاب ہو گیا۔

جب سندھانوالیوں نے یکم فروری سنہ ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ شیر سنگھ اس کے ولیعہد شاہزادہ پرتاب سنگھ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ کو یکے بعد دیگرے ایک ہی دن میں قتل کر دیا۔ تو انہوں نے ڈوگرہ خاندان کو بالکل ملیا میٹ کرنے کے لئے راجہ دھیان سنگھ کے بیٹے راجہ ہیرا سنگھ اور اس کے بھائی راجہ سوچیت سنگھ کو راجہ دھیان سنگھ کی طرف سے (جو قتل ہو چکا تھا) جعلی پیغام بھیج کر ایک مشورہ کیلئے بلوا بھیجا۔ یہ دونوں چچا بھتیجے اس وقت

---

[۱] تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف صفحہ ۲۴۶۔ [۲] تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف ہیں۔ ۱۴۔ جنوری کی تاریخ تو صحیح ہے۔ مگر سنہ ۱۸۴۱ء درج ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔

بدھو کے آوے پر مقیم تھے[۱]۔ جو سردار بُلائے گیا تھا اس کے ہمراہ پانچ سو سوار تھے۔ ہر چند ان دونوں کو مہاراجہ اور وزیر کی ہلاکت کا علم نہیں تھا۔ لیکن وہ سواروں کے تیوروں سے پہچان گئے تھے۔ کہ ان کی نیت بخیر نظر نہیں آتی۔ انہوں نے راجہ دہیان سنگھ کی تحریر طلب کی۔ آخر بات بڑھتی گئی۔ اور دونوں فوجوں میں اُسی مقام پر مقابلہ ہوا۔ اور سکھ سوار پسپا ہو کر واپس چلا گیا

جب راجہ ہیرا سنگھ کو حقیقتِ حال کا علم ہوا۔ تو اسی مقام پر اس نے سندھیا نوالوں کے خلاف سپاہ خالصہ کے سامنے کھڑے ہو کر دل ہلا دینے والی ایک تقریر کی۔ اور آخر اسی مقام سے بادشاہ اور وزیر کا انتقام لینے کے لئے چالیس ہزار فوج جن میں سکھوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی ایک سو توپوں کے ہمراہ شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ قریباً ستر سال سے یہ عالیشان[۲] خوبصورت کوٹھی جہاں ملک کے بادشاہ امراء اور وزراء مسکن گزیں رہے ہیں ستم روزگار کے قہر آلودہ ہاتھوں سے بے نام و نشاں چلی آتی ہے۔ پڑاوہ کے پہلو میں مسلمانوں نے اپنا قبرستان بنا لیا۔ اور خشت فروشوں اور کمہاروں نے پڑاوہ کھود کھود کر اس میں سے بہت سی جگہ نکال لی۔ راقم الحروف نے جب فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں سب سے پہلی مرتبہ شالامار باغ کی کتاب لکھی۔ تو اُس وقت پڑاوہ کا بہت سا حصہ ایک ٹیلہ کی صورت میں موجود تھا۔ لیکن آج وہاں ایک عریض و طویل میدان نظر آتا ہے۔ جہاں عیسائیوں کے مُردوں نے شہرِ خاموشاں آباد کر رکھا ہے۔ یہ قبرستان ایک وسیع چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ جہاں دو آدمی قبرستان کی نگرانی

---

[۱] تاریخ پنجاب صفحہ ۲۶۹ [۲] تحقیقات چشتی میں جو ۱۸۶۵ء کی تصنیف اور ۱۸۶۷ء کی مطبوعہ ہے صفحہ ۶۲۲ پر لکھا ہے۔ کہ اب وہ کوٹھی گر گئی ہے۔ اور پڑاوہ بطور ٹیلہ کھڑا ہے ؎

اور گل بوٹوں کی آبپاشی کے لئے ہمیشہ وہاں موجود رہتے ہیں ۔
اب نہ کوٹھی ہے نہ آوا - البتہ گورنمنٹ نے اتنی مہربانی کر دی ہے کہ مسیحی قبرستان اور مقبرہ بدھو کے درمیان ریلوے جنرل سٹور کی دیوار کے متصل ایک گول سا چبوترہ بنا کر اس پر ایک دیوار چار فٹ کھڑی کی ہے - جس پر سنگ مرمر کی ایک تختی پر کچھ انگریزی عبارت مرقوم ہے - جس کا مطلب یہ ہے "نظارہ بدھو کا آوا و کوٹھی جنرل اوی طویلہ" یا بالفاظ دیگر ع

مرہٹوں کا نشاں ہیں گویا

یہ چبوترہ شالا باغ کو جاتے ہوئے قبرستان بدھو کا آواہ سے ذرا آگے وائیں ہاتھ پر آتا ہے - اس کے گرد لوہے کی ایک زنجیر لگی ہوئی ہے ۔

مقبرہ یمین الدولہ آصف جاہ

میرزا غیاث کو جو بعد میں اعتماد الدولہ ہو گیا تھا - نور جہاں کا باپ ہونے کی وجہ سے کون نہیں جانتا - اسی باپ کا بیٹا اور اسی بہن کا بھائی "یمین الدولہ" تھا - جس کا اصلی نام میرزا ابوالحسن تھا - اور جس کو مختلف مراتب و مناصب سے ترقی دے کر جہانگیر نے ۱۰۳۵ھ میں لاہور[1] کا گورنر بنایا - اور ہفت ہزاری ہفت ہزار کا منصب اور آصف جاہ کا خطاب دیا تھا - یہ وہی شخص ہے - جس نے جہانگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اپنی بہن نور جہاں کو جس کا سکہ اور حکم بادشاہ کے پہلو بہ پہلو چلتا تھا نظر بند کر لیا - اور

---

[1] اس زمانہ میں پنجاب کے صوبہ کو صوبہ لاہور کہتے تھے ؎

۱۰۳۷ھ کو پانچ تیموری شہزادوں[۱] کو لاہور میں ایک دم قتل کر کے ہندوستان کا تاج و تخت اپنے داماد شاہجہان کے لئے خالی کر دیا۔ اور اسی دن لاہور میں شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

اس کا جاہ و جلال دیکھنا ہو۔ تو شاہجہان کا وہ خط پڑھو۔ جو اس نے لاہور میں اپنے معتمد خاص کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس کو بھیجا تھا۔ بادشاہ القاب و آداب میں اس کو لکھتا ہے " دانائے رموزِ سلطنت عظمیٰ۔ واقفِ اسرارِ جلالتِ کبریٰ۔ سرخیل یکرنگان وفادار۔ سالارِ بابِ جہنان حق گذار۔ کارفرمائے اربابِ سیف و قلم۔ مدبرِ امورِ عالم۔ زبدۂ قوانینِ عالیشان۔ قدوۂ امرائے بلند مکان۔ عضد الخلافہ۔ یمین الدولہ۔ عموے دانا آصف خان" اسی خط میں بادشاہ میرزا ابو الحسن آصف جاہ کو لکھتے ہیں۔ وہ خلعت جو جلوس کے دن پہنا تھا۔ آپ کے لئے بھیجتا ہوں۔ آپ عمو کو بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ ہم عنایت کرتے ہیں۔ اور بندرِ لاہری بطریق انعام مرحمت کرتے ہیں۔ آپ اس منصب سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ لیکن سردست ہماری یہ عنائتیں آپ کو مبارک ہوں[۲]۔

رموز دانانِ تاریخ جانتے ہونگے۔ کہ بادشاہ نے اسی خط کے ذریعہ علاوہ اضافہ منصب وغیرہ کے آپ کو "یمین الدولہ عموے دانا آصف خان" کے عظیم الشان اور بزرگانہ خطاب بھی مرحمت فرمائے تھے۔

---

[۱] یہ شہزادے جہانگیر کے بھتیجے اور شاہجہان کے بھائی اور بھتیجے تھے۔ انہی میں شہریار نورجہاں کا داماد بھی تھا۔ جو شاہجہان کے مقابلہ میں تخت و سلطنت کا حقدار تھا (از ماثر الامراء و ظفر نامہ شاہجہان و خلاصۃ التواریخ) [۲] ظفر نامہ شاہجہان و تاریخ ہند ذکاء اللہ کی جلد ہفتم صفحہ ۵۶)

جہانگیر کے انتقال اور شاہجہان کے ابتدائی عہد میں آصف جاہ لاہور اور ملتان دونوں صوبوں کے گورنر تھا۔ جب وہ سنہ ۱۰۳۷ھ میں اورنگ زیب شجاع اور دارا شکوہ کو ہمراہ لے کر لاہور سے آگرہ کو روانہ ہوا ہے۔ اور وہاں ۱۲- رجب کو بادشاہ کے جشن قمری میں شامل ہوا ہے۔ تو قدردان بادشاہ نے اُس کو پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا کی۔ اور منصب نہ ہزاری ذات و نہ ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ عطا فرمایا۔ یہ وہ عروج و اقتدار تھا۔ کہ آج تک کوئی تیموری امیر اس مرتبہ کو نہیں پہنچا تھا۔
سنہ ۱۰۳۹ھ مطابق سنہ ۱۶۲۹ء میں یمین الدولہ کو خان خاناں کا خطاب اور تمام ہندوستان کی سپہ سالاری کا عہدہ عطا ہوا۔ اور وہ مرتے دم تک اسی عہدہ پر رہا۔ یمین الدولہ نے بیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے دس سال کے عرصہ میں ایک عالیشان حویلی لاہور کے میدان نخاس[1] میں تیار کی تھی۔ بادشاہ جب سنہ ۱۰۴۳ھ مطابق سنہ ۱۶۳۴ء میں لاہور آیا۔ تو اس حویلی میں یمین الدولہ نے اس کی دعوت کی۔ اور چھ لاکھ روپیہ نذر پیش کیا۔
سنہ ۱۰۵۱ھ و سنہ ۱۶۴۱ء میں سلطنت کا یہ زبردست ستون صرصر اجل کے ایک ہی جھونکے سے گر پڑا۔ بادشاہ نے بڑا رنج کیا۔ اور اس کے بڑے بیٹے شائستہ خان کو جو صوبۂ بہار کا گورنر تھا۔ خلعت خاصہ اور فرمان تسلی بھیجا۔ اور اسکے متوسلین و متعلقین اور اس کے دوسرے بیٹوں اور بیٹیوں اور اس کی بیگم کو بڑے بڑے مراتب اور منصب اور بیش بہا خلعت دیکر ان کی دلجوئی کی۔ نہایت افسوس

[1] میدان نخاس دہلی دروازہ کے باہر تھا۔ جہاں آجکل سرائے میاں سلطان۔ لوہا بازار۔ لنڈا بازار اور شہید گنج واقع ہے۔ دارا شکوہ اور اس کے حرم سرا اسی حویلی میں رہتے تھے۔ لنڈا بازار اور مسجد شہید گنج کے درمیان جو جگہ ہے۔ اس کا نام اب تک چوک دارا مشہور ہے

آصف خاں" ۱۰۵۱ھ[1] تاریخ وفات ہے۔ اس کی امارت و دولت کا کچھ شمار نہ تھا۔ مآثر الامراء[2] میں لکھا ہے:" اخراجات و مصارفے کہ در سرکارش بود بعقل نے گنجد" اس پر بادشاہ اور شاہزادوں اور بیگمات کو پیش کش (نذور نقدی) اور دعوت ہائے پُر تکلف الگ۔ دہلی۔ آگرہ اور کشمیر میں اس کی جائداد اڑھائی کروڑ تک درج رجسٹر ہوئی۔

بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ لاش روضۂ جہانگیر کے غربی جانب دفن کی جائے مقبرہ کے چاروں طرف ایک بلند چاردیواری کے اندر باغ تعمیر کیا جائے۔ اور تربت کا گنبد بلند اور عالیشان ہو۔ جو اس کے نام اور کام کی طرح اس کی یادگار رہے۔ ٭

اب اس کے مقبرہ کا حال شروع ہوتا ہے۔ جس نے اپنے ہاتھوں سے شاہجہان کو تخت پر بٹھایا۔ جو صوبہ پنجاب کا گورنر اور تمام ہندوستان کا سپہ سالار تھا۔ جس کے مال و دولت کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ جس کی بہن نورجہان جہانگیر کی ملکہ۔ اور بیٹی ممتاز محل شاہجہان کی بیگم تھی۔ اور جس کا بیٹا صوبہ بہار کا گورنر اور باپ جہانگیر کا دیوانِ بیوتات تھا۔

بادشاہ کے حکم سے یہ مقبرہ تمام و کمال سنگ مرمر کا تیار کیا گیا۔ مقبرہ کے اندر کا فرش۔ باہر چبوترہ کا فرش۔ قبر کا تعویذ۔ حوضوں کے کنارے۔ یہاں تک کہ عالیشان دروازہ کی ڈیوڑھی کا فرش بھی سنگِ مرمر کا تھا۔ مقبرہ کے آٹھ دروازے اور آٹھ دہلیزیں اور باہر مرغولوں پر ہر جگہ سنگ سرخ اور اس کے اوپر کاشی کا کام تھا۔ جب پنجاب کی حکومت بیدردوں کے ہاتھ آئی

---

[1] جلد اول صفحہ ۱۵۵ [2] تاریخ لاہور اردو رائے کنہیا لال و تحقیقات چشتی اردو۔ و تاریخ لاہور انگریزی جج محمد لطیف ٭

تو باغ اور مقبرہ کی یہ ڈیوڑھی جو اس گلستان میں گلدستۂ صد رنگ تھی۔ وادیٔ پُرخار میں ایک ویران سا نشان سنگ بن کے رہ گئی۔ ڈیوڑھی دو منزلہ ہے۔ دونوں طرف اُوپر جانے کے لئے ۲۶-۲۶ سیڑھیاں ہیں۔ گرمی کے دن ہوں اور ڈیوڑھی کی دوسری منزل میں نشست گاہ ہو۔ اور وہ شخص وہاں موجود ہو۔ جس کو مبدأ فیاض نے چشم بصیرت دماغ نکتہ رس اور دل دردمند عطا کیا ہو۔ تو معلوم نہیں ہوا کی لطافت و رُوح پروری اور اس عالیشان مگر عبرتناک سر بفلک آخری منزل گاہ کی نزہت پا دینے والی کیفیت اس کے تخیلات کو کہاں سے کہاں پہنچا دے ؎

ڈیوڑھی سے مقبرہ تک دو رویہ پختہ خشتی فرش اور درمیان میں چھوٹی سی نہر ہے۔ جو مقبرہ کے گرد کی چاروں چھوٹی چھوٹی شاخوں میں چکر لگاتی ہے۔ مقبرہ میں سونے چاندی کی قندیلیں اور جھاڑ فانوس اور فرش فروش جہانگیر کے مقبرہ سے کم نہ تھے۔ قرآن شریف پڑھنے کے لئے ایک حافظ خانہ اور ایک مطبخ خانہ بھی تھا۔ علاوہ ازیں اور مکانات بھی تھے۔ جن میں چوکیدار اور محافظ وغیرہ رہتے تھے۔ یہ سب عمارتیں پتھر کی طمع سے بیدرد حاکموں نے منہدم کرا دیں اور سونے چاندی کے سامان شیر مادر سمجھ کر لُوٹ لے گئے۔ سہ حاکمانِ لاہور[1] کا زمانہ خصوصیت کے ساتھ اہلِ لاہور اور شاہانِ سلف کی یادگاروں کیلئے ایک زلزلہ اور طوفان بلکہ قیامت سے کم نہ تھا ؎

رنجیت سنگھ کا دور آیا۔ تو اس نے حضوری باغ لاہور کی بارہ دری اور دربار امرتسر کی تعمیر کے لئے کئی اسلامی مقبرے بیخ و بن سے اُکھاڑ دیئے۔ مہاراجہ کے حکم سے اس مقبرۂ عالیشان کا پتھر بھی اُتار گیا۔ لیکن ایسی بے احتیاطی کیساتھ

[1] تاریخ لاہور اردو رائے کنہیا لال صفحہ ۳۲۸

کہ وہ مقبرہ جس میں سونے چاندی کا سامان اور جھاڑ فانوس اور سنگ مرمر سنگ سُرخ کا فرش تھا ایک کھنڈر کی طرح نظر آنے لگا۔ مقبرہ میں اوپر جانے کے راستہ پر جو سیڑھیاں تھیں اُن کا پتھر نہایت بیرحمی سے اُکھاڑا گیا۔ مقبرہ کے اندر سنگِ مرمر کا جو فرش تھا۔ اس کو بھی اُکھاڑ کر شہر میں لے آئے صرف قبر کا تعویذ اس لئے سلامت رہ گیا۔ کہ اس پر نوو نہ نام باری تعالیٰ کے لکھے ہوئے تھے۔ اور وہ ان کے کسی کام نہ آسکتا تھا[1]

اس وقت کی حکومت کے اس بیدردانہ سلوک کا ہندو مسلمان مورخوں کے علاوہ اس زمانہ کے انگریز سیاحوں نے بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ولیم مورکرفٹ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں لاہور آیا تھا۔ اور جس کی مہاراجہ نے کمال عزت کی تھی۔ اپنے سفرنامہ میں (صفحہ ۱۰۴ پر) حضوری باغ کی بارہ دری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "مہاراجہ نے حضوری باغ میں جو نشستگاہ بنائی ہے۔ اس میں اور مقبروں کے علاوہ نورجہاں کے بھائی آصف جاہ کے مقبرہ کا پتھر بھی اس کے فرش اور گنبد سے اُتار کر لگایا گیا ہے"

اس ہشت پہلو مقبرہ کے چبوترہ پر (جس کا فرش سنگ مرمر کا تھا) جو چار فوارہ دار حوض ہیں۔ اور جن کے کناروں پر سنگِ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ ہشت پہلو نہر جو مقبرہ کے گرد چکر لگاتی ہے۔ ان سے لاہور کے لوگ ایک عرصہ سے لاعلم چلے آتے تھے۔ باغ کی ساری زمین پر قبضہ کرنے کے

---

[1] تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۳۲۵

[2] اس باغ کے دو تختے شاہدرہ کے ایک سکھ خاندان کے قبضہ میں چلے آتے تھے۔ گورنمنٹ نے قابضوں کو معاوضہ دے کر ان دونوں تختوں کو مقبرہ اور باغ کے ساتھ شامل کر دیا ہے

بعد جس کو تین چار سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ مٹی کے بڑے بڑے تودوں اور انباروں کے نیچے نہروں اور حوضوں کے نشان ملے۔ جن کو صاف کرا کر باغ اور مقبرہ کی رونق و زیبائش میں اضافہ کیا گیا۔ باغ جس کا اندرونی رقبہ تین بیگھہ بیان کیا جاتا ہے۔ نہایت مصفا حالت میں ہے۔ ایک کنواں اسی زمانہ کا مقبرہ کے مشرق میں بالکل اس کے متصل ہے۔ اور ایک مغربی اور جنوبی گوشہ میں بیرونی دیوار کے پاس گورنمنٹ پنجاب نے 1880ء میں رائے کنہیا لال مولفِ تاریخ لاہور کی معرفت اس عالیشان مقبرہ کی کچھ مرمت کرائی تھی۔ اور اسی مرمت کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ اس مقبرہ کا یہ ہیبتناک گنبد گرنے سے بچ گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد گورنمنٹ نے اس وقت اس مقبرہ کی خبر لی جب 1904ء یا 1905ء میں لارڈ کرزن وائسرائے و گورنر جنرل کی توجہ سے آثار قدیمہ کا محکمہ قائم ہو گیا۔ مقبرہ کے گنبد کی سیڑھیاں سنگ سرخ اتار کر جن پر سے سیڑھیوں کے نشان ہی مٹا دیئے گئے تھے۔ از سر نو مرمت ہوئیں گنبد دو منزلہ بلکہ سہ منزلہ ہے

سنگِ مرمر کا تعویذ جو باری تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی وجہ سے بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینکدیا گیا تھا۔ گورنمنٹ کی توجہ سے اب پھر اپنی اصلی جگہ پر آ گیا ہے۔ اس تعویذ پر دو طرف تو باری تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ سرہانے کی طرف "هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْم۔ اور بالائے تعویذ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ لکھا ہوا ہے۔ حروف کئی جگہ سے اکھڑ رہے ہیں۔ کاش ان کی پھر درستی ہو سکے۔

مقبرہ کی بیرونی دیواروں پر ذرا غور سے دیکھو گے۔ تو کہیں کہیں مٹے ہوئے اُبھرے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے سبز۔ زرد اور نیلگوں پتھروں کے قدیم نقش و

نگار نظر آئینگے۔ مولفِ تحقیقاتِ چشتی لکھتا ہے۔ یہ علامات ان منبت کار نقش و نگار۔ نگدار زرد و سیاہ پتھروں کی ہیں۔ جو چندروزہ حکومت کے نشہ میں ابدی لعنت و نفرت حاصل کرنے والوں نے یہاں سے اُتار لئے تھے۔ مقبرہ کے اندر اور باہر جہاں شاہجہانی زمانہ میں سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ اور بہ حاکمانِ لاہور اور سکھوں کے عہد میں جہاں ناہموار کھنڈر سے تھے۔ سرکار انگریزی نے پختہ چونہ گچ فرش کرا دیا ہے۔ اسی طرح ڈیوڑھی کے اندر بھی مستحکم مرمت کرا دی ہے۔ اور اب یہاں حفاظت و نگرانی کے لئے سرکار کی طرف سے ایک مجاور بھی رہتا ہے +

مقبرہ کے چونہ گچ چبوترہ کے دو پہلوؤں پر پیپل کے دو بڑے بڑے درخت سہ حاکمانِ لاہور کی سنگدلی اور اس عمارت کی سخت جانی کی شہادت دے رہے ہیں +

مقبرہ کے بالکل محاذ میں مغرب کی سمت ایک پختہ مسجد ہے طوائف الملوکی کے ایام میں اس کا پتھر اُکھاڑ گیا۔ اور عہدِ برطانیہ میں ۱۸۵۸ء سے پیشتر محکمہ ریلوے کے ملازم کسی انگریز نے اس کی شکل بدل کر اسے کوٹھی بنا لیا تھا۔ اب وہاں نہ کوٹھی ہے نہ صاحب۔ مسجد کے آثار البتہ نظر آ رہے ہیں

عہدِ مغلیہ کے چند گورنر

(۱)

شاہ ابوالمعالی کو ہمایون نے تربیت و عنایاتِ شاہی سے درجہ امارت پر پہنچانے کے بعد صوبہ پنجاب کی حکومت بھی عطا کر دی تھی۔ اس کی نخوت

و بے اعتدالی بلکہ بدخُلقی و بدچلنی سے امرائے دربارِ لاہور کے علاوہ رعایا کے دل بھی شکایات و نفرت سے لبریز رہتے تھے۔ ہمایوں تک شکائتیں پہنچتی تھیں۔ لیکن وہ مناسب توجہ نہیں کرتا تھا۔ جب اکبرؔ تخت نشین ہوا۔ تو شاہ ابوالمعالی اسے لڑکا سمجھ کر اور بھی کھُل کھیلے۔ اس کا اقتدار اور رُعب ایسا تھا۔ کہ کسی کو شکایت کی جُرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ کچھ لوگ سر پر کفن باندھ کر اکبرؔ کے دربار میں پہنچے۔ بیرمؔ خاں جیسا جہاندیدہ اس کا مشیر و اتالیق تھا۔ اُس نے جوابدہی کے لئے دربار میں بُلوایا۔ اور ذلیل و رُسوا کر کے اُسی لاہور میں جہاں وہ بادشاہی تقرب و حکومت کے غرور میں بے گناہوں کو لوٹتا۔ بے عزت کرتا۔ جیل خانوں میں بھجواتا اور بالاخر قتل کرا دینا بھی معمولی بات سمجھتا تھا۔ زندان خانہ میں ڈالدیا گیا ۔

(۲)

حسینؔ خاں ٹکڑیہ دیانتداری۔ سخاوت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ ۹۶۵ھ میں کہ اکبرؔ کا اوائل عہدِ سلطنت تھا حاکم لاہور مقرر ہوا۔ فاضل بدایونی جس کے نوکِ قلم سے امرائے اکبری کے کلیجے چھلنی ہوتے رہے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتا ہے " جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ اور پلنگ اور نرم بچھونوں پر نہیں سوتے تھے۔ اس خیال سے کہ نہ آنحضرت نے ان تکلفات سے کام لیا ہے اور نہ اُس شخص کے لئے یہ مناسب ہے جس کے ذمہ غریبوں کی خبر گیری و حفاظت کا کام ہو۔ وہ چارپائی پر نہیں سوتا تھا۔ تہجد تک کی نماز قضا نہ کرتا تھا۔ لوگوں سے اپنی تعریف میں ایڈریس نہ لیتا تھا۔ بلکہ علماء و مشائخ کی صحبت سے اپنے عیوب و نقائص کی اصلاح کرتا تھا۔ پنجاب کی صوبیداری کے علاوہ لاکھوں کی جاگیر کا مالک تھا۔ مگر خاصہ میں ایک گھوڑے سے زیادہ نہ رکھتا تھا۔

کہتا تھا۔ جو روپیہ پیسہ میرے پاس آتا ہے۔ جب تک خرچ نہیں کر لیتا پہلو میں تیر سا کھٹکتا رہتا ہے۔ غرباء۔ سفید پوش۔ مستحقین خیرات۔ بیوگان سب کے وظائف اور روزینے مقرر تھے۔ کوئی اس کے دربار سے خالی نہ جاتا تھا۔

۹۸۵ھ میں انتقال کیا۔ تو ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ قرض نکلا۔ قرض خواہ آئے۔ سب نے خوشی خوشی تمسک پھاڑے اور مغفرت کی دعائیں دے کر چلے گئے ٭

(۳)

حاجی محمد خاں سیستانی حاکم لاہور تھے۔ اور سکندر خاں سوری اپنی قومی جمعیت کے ساتھ پہاڑوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ کہ ہیموں پر اکبر کی فوجکشی کی خبر سن کر باہر نکلا۔ اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس زمانہ میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری کی دولت و مالداری کا سارے ہندوستان میں چرچا تھا۔ اور اس وقت ہیموں کے استقبال اور سکندر کے اخراج کے لئے روپیہ اور فوج دونوں کی ضرورت تھی۔ حاجی محمد خاں نے مخدوم الملک سے روپیہ نچوڑنے کا بہترین موقع پایا۔ جب سیدھے ہاتھوں نہ ملا۔ تو اکبر کے خلاف سکندر کیساتھ سازش کرنے کا الزام لگا کر وہ گنج قارون جو اس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا۔ دم میں اگلوالیا۔ بیرم خاں اتالیق کو اس سختی و تشدد اور اس ظلم و ناانصافی کی خبر ہوئی گورنر پر علانیہ خفگی و ناراضگی کا اظہار کیا۔ اور فتح کے بعد جب اکبر کے ساتھ لاہور آیا۔ تو حاجی کے وکیل کو مخدوم الملک کے گھر عذر تقصیر کے لئے بھجوایا۔ اور اس کے نام ایک لاکھ ٹنکہ کی جاگیر مقرر کرادی ٭

(۴)

عہد اکبری کے گورنران لاہور میں مرزا حسین قلیچ جو اکبر کے سمدھی مرزا

قلیج خاں اندجانی کا بیٹا تھا۔ ایک نامی گورنر گذرا ہے۔ شجاع و سخی اور صاحب علم و فضل تھا۔ لیکن بہت بڑا عیب یہ تھا۔ کہ اپنے محبوب ترین بیٹے میرزا لاہوری (جو لاہوری بیگم کے بطن سے تھا) کی محبت میں ایسا مغلوب تھا۔ کہ اس کی ناہنجاریوں اور بدکرداریوں پر عمداً پردہ پوشی کرتا تھا۔ مآثر الامراء میں لکھا ہے "میرزا لاہوری آئینے بود از جلال بل آفتے بود مالامال پارچہ گوشتے کریہہ منظر بدخصائل" اُس کا عیش و نشاط یہ تھا۔ کہ لوگوں کو تازیانے لگاتا تھا۔ اور اُن کی چٹاخ پٹاخ سے خوش ہوتا تھا۔ خلق خدا اُس کے ظلم سے نالاں تھی۔ گورنر یعنی اس کے باپ کے پاس فریاد کرتی تھی۔ لیکن وہاں شنوائی نہ ہوتی تھی۔ جس خدمتگار پر ادنےٰ سے قصور پر بھی ناراض ہوتا اُسے زندہ زمین میں گڑوا دیتا۔ اور کہتا جاؤ منکر نکیر کی خبر لاؤ۔ اور جو سوال و جواب ہوں وہ ہمیں بتاؤ۔ چند دنوں کے بعد گڑھے کھدوائے جاتے۔ تو وہ مظلوم مردہ پائے جاتے۔ مسلمان اور ہندو سب اس سے پناہ مانگتے تھے جب کسی شادی کا ذکر سنتا۔ تو خود وہاں جاتا۔ اور عروس کو جبراً اپنے مکان پر لے آتا۔ غرض اہلِ لاہور کی جان اس کریہہ منظر ناہنجار نوجوان کے ہاتھوں ایک عذاب میں مبتلا تھی۔ میرزا حسین قلیج جو بادشاہ کی طرف سے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی عزت و آبرو کا محافظ تھا۔ باوجود دعویٰ و تقویٰ یہ سب کچھ دیکھتا تھا۔ اور بیٹے کو ایک لفظ تک نہیں کہتا تھا۔ آخر غریبوں اور مظلوموں کی ضعیف و کمزور آواز چند دل جلے ہندو مسلمانوں کی وساطت سے بارگاہِ اکبری تک پہنچی۔ اور تحقیقات کے بعد میرزا حسین قلیج معزول کیا گیا۔ اور اس کے بیٹے کو ذلت کی تشہیر کے ساتھ زندان میں پہنچایا گیا ⁂

(۵)

قوام الدین خاں اصفہانی عالمگیر کے سال جلوس ہفتم میں ہندوستان آیا۔ اور اکیسویں سال جلوس تک اُس نے یہاں تک ترقی کی کہ صوبہ لاہور ہوگیا۔ بلکہ جموں کی فوجداری بھی اُسی کے سپرد ہوگئی۔ ان دنوں لاہور میں سید علی اکبر الہ آبادی قاضی القضاۃ تھے۔ دونوں میں کسی بات پر مخالفت ہوگئی۔ کوتوال شہر نظام الدین نام بھی قاضی القضاۃ سے اس بنا پر جلا بیٹھا تھا۔ کہ قاضی اپنی عدالت میں پولیس کی ہر بات کو وحی والہام کا مرتبہ دینے کے لیئے تیار نہیں تھا۔ گورنر کے حکم سے کوتوال قاضی کو گرفتار کرنے کے لیئے گیا۔ قاضی اور اُس کے ہمشیرہ زادہ نے دروازے بند کر لیئے۔ لیکن اس دار وگیر میں قاضی اور اس کا بھانجا دنیا کی دار وگیر سے مخلصی پا گئے۔ اہالیان لاہور نے اپنی گفتار و کردار سے کوتوال اور صوبہ لاہور پر لعن طعن اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ لاہور میں بلوۂ عظیم ہوگیا۔ عالمگیر کو اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ کوتوال اور صوبیدار دونوں کو خدمت و منصب سے معزول کر کے حکم دیا۔ کہ کوتوال کو تو ورثائے قاضی کے حوالے کیا جائے۔ اور صوبیدار کو دہلی بھیجا جائے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ لوگوں کو گورنر سے اس قدر نفرت تھی۔ کہ اُس کو ایک پردہ دار پالکی میں چھپا کر شہر سے باہر لے گئے ۔

(۶)

عالمگیر نے انیسویں سال جلوس میں میر معین الدین احمد المخاطب بہ امانت خاں کو لاہور کی نظامت و دیوانی مرحمت کی۔ امانت خاں کے نام ایک مرتبہ بادشاہ کا حکم پہنچا۔ کہ فلاں شخص کو حاضر حضور کرو۔ امانت خاں نے اسکو طلب کیا

اور بادشاہ کا حکم سنایا۔ وہ شخص بہت ڈرا۔ اس نے کہا۔ اگر آپ میری جان و مال کے کفیل ہوتے ہیں۔ تو مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ امانت خاں نے کہا۔ میں ایسے شخص پر جس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو تم سے پوشیدہ نہیں ہے کس طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔ مخبروں نے ڈاک بہ ڈاک یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی۔ بادشاہ نے غم و غصہ سے بیتاب ہو کر منصب جاگیر اور دیوانی کی معزولی کا حکم دیا۔ مگر بعد میں خود ہی خیال آیا۔ کہ جو شخص امر حق کے اظہار میں ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ اور صرف اپنے خدا سے ڈرتا ہے۔ اس سے بہتر آدمی اور کہاں ملیگا۔ چنانچہ اس کی بحالی کے احکام دوبارہ جاری کئے۔ بلکہ منصب و اعزاز میں اضافہ کر دیا (ماثر الامرا جلد دوم صفحہ ۲۶۱) امانت خاں سے اہل عملہ و دفتر سب نالاں تھے۔ لیکن عام لوگ اور زمیندار سب خوش تھے۔ ایک مرتبہ عمال لاہور نے بقایا و مطالبہ کے وصول نہ ہونے پر جیل خانہ میں اس قدر آدمی بھیجے کہ جگہ تک نہ رہی۔ امانت خاں کو جب علم ہوا۔ تو محبوس خانہ میں خود آیا۔ قیدیوں کو دیکھا اور بہت افسوس کیا۔ بعض سوالات کے جواب میں قیدیوں نے اپنی ناداری و فلاکت بیان کی۔ اور عمالانِ مطالبہ دار کے مظالم بھی بیان کئے۔ امانت خاں نے سوچا۔ کہ ان کی جائداد میں ضبط کرنے اور ان کو جیل خانوں میں ٹھونس دینے سے حکومت کو بقایا و مطالبہ تو وصول ہونے سے رہا۔ البتہ ان لوگوں کے دلوں میں جو گرہ حکومت کے متعلق بیٹھ جائیگی اس کا نکلنا دشوار ہو جائیگا۔ چنانچہ جن کے عذر معقول تھے۔ ان کو بالاقساط ادا کرنے کے وعدہ پر رہا کر دیا۔ اور ایک تعداد کو جو بالکل مفلس و نادار تھی بقایا رقم معاف کر دی۔ یہ رقم ماثر الامرا میں دو لاکھ روپیہ بیان

کی گئی ہے۔ عالمگیر نے سنا۔ تو اُس کی مصلحت اندیشی اور خدا ترسی پر تحسین کی ؎

(۷)

جب نادر شاہ ایرانی نے ہندوستان پر (۱۷۳۹ء میں) حملہ کیا ہے اسوقت محمد شاہ بادشاہ دہلی کیطرف سے پنجاب پر شیر الدولہ نواب زکریا خاں کی حکومت تھی۔ نواب زکریا خاں عدل گستر اور ہر دلعزیز تھا۔ ان کی ہر دلعزیزی وان کے عدل و انصاف کے تاریخوں میں کئی واقعات درج ہیں۔ یہاں مختصر طور پر صرف ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے :-

ایک آغا صاحب لاہور کی ایک باعصمت ہندو عورت پر فریفتہ ہو کر اس کو بہکانے اور پھسلانے میں جب ناکامیاب رہے۔ تو اُسکی دھوبن سے ملکر اور بہت کچھ دے دلا کر اور اُسی ہندو عورت کے کپڑے دھوبن کو پہنا کر گھر میں بلا لیا۔ نکاح خوان اور دوست احباب سب پہلے ہی موجود تھے۔ ظاہر یہ کیا۔ کہ وہ ہندو عورت مسلمان ہونے آئی ہے۔ اور اسلام قبول کرنے کے بعد آغا صاحب سے باقاعدہ اس کا نکاح ہو جائیگا۔ چنانچہ ساری کارروائی مقررہ پروگرام کے مطابق طے پائی۔ خرمے لٹائے گئے۔ اور دوسرے دن دعوت ولیمہ بھی تیار ہو گئی۔ یہ کھیل رچانے کے بعد آغا صاحب ہندو عورت کے خاوند کے گھر پہنچے۔ اور کہنے لگے۔ کہ تمہاری عورت مسلمان ہو کر میرے ساتھ نکاح پڑھا چکی ہے۔ اور اب مرتد ہو کر پھر یہاں آگئی ہے۔ بھلا مانس ہے تو اس کو باہر نکال دے۔ ورنہ زبردستی لیجاؤنگا۔ خاوند اور بیوی اور ان کے رشتہ دار آغا صاحب کے یہ الفاظ سن کر دریائے ندامت میں غرق ہو رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ زمین پھٹے اور ہم سما جائیں۔

مختصر یہ ہے۔ کہ مقدمہ لاہور کے قاضی صاحب کے سامنے پیش ہوا۔
ور اس ملمع سازی سے پیش کیا گیا۔ کہ قاضی صاحب کو فیصلہ آغا صاحب
کے حق میں دینا پڑا۔ جب یہ فتوے تعمیل کے لئے زکریا خاں کے پاس
آیا۔ تو ساری مثل پڑھنے کے بعد حکم دیا۔ میں سوچ سمجھ کر حکم دونگا۔
اس نے رات کو بھیس بدلا۔ پہلے کھتریوں کے محلّہ میں گیا۔ وہاں کچھ
لوگ آغا کی زیادتی اور ہندو عورت کی پاکدامنی کی باتیں کر رہے تھے۔ پھر
آغا کے محلہ میں گیا۔ وہاں جاتے ہی سُنا۔ یہ مغل مفتری جھوٹا اور مکّار ہے
اُس نیکبخت ہندو عورت کو ہم۔نے کبھی اس سے بات چیت کرتے دیکھا ہے
نہ کبھی اُس کے مسلمان ہونے کی خبر سُنی ہے۔ اس نے جعلسازی کر کے خود ہی
اس کے مسلمان ہونے اور اسے اپنے نکاح میں لانے کی خبر مشہور کر دی ہے
غرض یہ چلتے چلاتے دہوبن نے بھی ساری داستان کہہ سُنائی۔ جب
زکریا خاں کا کامل اطمینان ہو گیا۔ اور چاروں طرف سے اس ہندو عورت کی
عصمت و عفت کی شہادتیں مل گئیں۔ تو آغا صاحب اور اُس کی دہوبن کو
قتل کی سزا کا حکم سُنا کر نہ صرف اس عورت کے ناموس کو ہمیشہ کے لئے بدنامی
سے بچا لیا بلکہ اپنے لئے بھی بقائے دوام کا خلعت حاصل کر لیا ✦

انارکلی[1]

لاہور کا انارکلی بازار نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں

[1] انارکلی کے متعلق عہد اکبری اور عہد جہانگیری کی تاریخیں قطعی خاموش ہیں۔ اور تعجب
آتا ہے۔ کہ عبد القادر بدایونی اور ابو الفضل اور عہد اکبر کے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۹۲)

میں اپنی رونق۔ چہل پہل اور اپنے دلکش اور عجیب و حیرت افزا و شگفتہ
نام کی وجہ سے مشہور ہے۔ مگر یہ بات کس قدر عجیب بات ہے۔ کہ جس قدر
شہرت عالمگیر ہے۔ اسیقدر اسکی اصل وجہ سے نہ صرف پنجاب و ہندوستان
کے لوگ بلکہ خود اہل لاہور بہت کم آگاہ ہیں۔ اور اس بات کا تو شاید کسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱) دیگر مورخوں نے اس عظیم واقعہ کو کس طرح فراموش کردیا۔ اسی بناء
بعض مبصرین اس واقعہ کی صحت بلکہ انارکلی کے وجود کو تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں
البتہ لاہور کی تاریخوں میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اور انہی تاریخوں سے
ہمارا مضمون ماخوذ ہے :۔
جہانگیر کے زمانہ میں کئی فرانسیسی اور انگریز سیاح ہندوستان میں آئے ہیں ا
میں سر ٹامس رو سفیر شاہ انگلستان۔ فرانسیسی ڈاکٹر برنارڈ۔ ڈاکٹر برنیر۔ کپتان ہاکنز
اور ہربرٹ صاحب بہت مشہور ہیں۔ ان سب نے اپنے سفرنامے لکھے ہیں۔ اور ہر چند ا
میں بہت کچھ اناپ شناپ بھی ہے۔ مگر بہت سے ایسے حالات بھی ہیں۔ جن سے اُ
زمانہ کے درباری واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں ہربرٹ صاحب جس نے عہد
جہانگیر کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ ۱۶۲۶ء میں ہندوستان میں آیا تھا۔ وہ اپنے سفرنا
میں (جس کا حوالہ کارنامہ جہانگیری صفحہ ۲۵۷ پر ہے) ایک واقعہ ایسا لکھتا ہے
جس کا تعلق انارکلی سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "جہانگیر نے اکبر کی کسی
کو جو اُسے نہایت عزیز تھی۔ اور انار کے نام سے مشہور تھی بے عزت کیا۔ باپ نے
اس وعدہ پر کہ میں تجھے معاف کردونگا۔ بیٹے نے اطاعت کرلی۔ باپ بیٹے کو
حرم سرا میں لے گیا اور طیش میں آکر اور وعدہ کو بھول کر بیٹے کو گدھا اور احمق کہا
اور ایسے گھونسے مارے کہ وہ گر پڑا" مسلمان ان سفرناموں کو غیر معتبر جانتے ہیں
اور اپنی قصہ کہانیوں اور بازاری افواہوں کے اندراج کی نمائشی دلچسپیوں کی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۹۳)

نان گمان بھی نہ ہو - کہ یہ ایک ایسی عورت تھی - جس کے حُسنِ دلاویز نے اکبری
لوں میں شاہزادیوں اور شاہی بیگمات کو پریشان کر رکھا تھا -
اس کا اصلی نام نادرہ بیگم بتایا جاتا ہے - اکبر کی شاہی کنیزوں میں نہایت
سینہ و جمیلہ تھی - کمالِ حُسن کی وجہ سے اکبر کی اسقدر منظورِ نظر تھی - کہ حرم سرا
ں تمام بیگمات اس کے عروج و اقبال اور رسوخ و اقتدار سے خوف کھاتی تھیں
شاہ نے اپنی اس کنیز کا نام انارکلی رکھا - جس کا چہرہ گلِ انار کیطرح سُرخ

ں وہ ہیں بھی اسی قابل - مثلاً اکبر کی تمام شادیوں کا جو مسلمانوں کے ہاں اور
جپوت راجاؤں کے ہاں ہوئی ہیں سب تاریخوں میں ذکر ہے - لیکن انار کے
م سے اُس کی کسی بیگم یا رانی کا ذکر نہیں ہے -
ہربرٹ کے یہ الفاظ بھی پایۂ صداقت سے گرے ہوئے ہیں - کہ اُس
جہانگیر کو جو اپنی پیدائش ۹۷۷ھ کے مطابق اس وقت اٹھ سال
عمر کا تھا - اور کئی بچوں کا باپ تھا - اسے گھونسے مارے کہ وہ گر پڑا -
البتہ انارکلی کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے - اس لئے کہ دارا
کوہ نے جو جہانگیر کا پوتا اور شاہجہان کا ولیعہد تھا - اپنی کتاب
ینۃ الاولیا میں باغ انارکلی کا ذکر کیا ہے - خیال یہ ہے - کہ انارکلی کا
ل نام ضرور کچھ اور ہی ہوگا - اس کا نام نار یا انارکلی اکبر نے
کی خوبصورتی کی وجہ سے رکھ دیا ہوگا - "انارکلی" گو بے ربط سا
ہے - لیکن ایسا ہی ہے - جیسا جہانگیر کے زمانہ میں شراب کا نام
م رنگی" تھا ◆

تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہزادہ سلیم اور انارکلی کی آپس میں خفیہ محبت تھی
چونکہ عشق اور مشک چھپے نہیں رہ سکتے۔ اس لئے رازِ محبت خواہ لاکھ
پردوں میں ہو۔ پھر بھی افشاء ہو ہی جاتا ہے۔ بقول استاد داغ

ہم بھی رسوا ہو گئے وہ بت بھی رسوا ہو گیا
رازِ دل جتنا چھپایا اتنا افشا ہو گیا

رفتہ رفتہ یہ ناشائستہ خبریں بادشاہ کے گوش گزار بھی ہوئیں۔ بلکہ ایک
مرتبہ اکبر شیش محل میں نشست فرما تھا۔ انارکلی بھی موجود تھی۔ شاہزادہ
بھی وہاں آ گیا۔ دونوں کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
اور پیار و محبت کی جو باتیں ایک دوسرے سے کرنا چاہتے تھے وہ دل
سے زبان پر تو نہ لا سکتے تھے۔ مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں سب مطا
ادا ہو رہے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی د
تھے۔ اکبر کی نگاہ بڑی دور رس تھی۔ وہ یہ تمام حرکات اسی آئینہ خانہ
ایک دوسرے کے عکسوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور جو باتیں وہ کئی دن
سے ان دونوں کے متعلق سن رہا تھا۔ آج اپنی آنکھوں سے اس
تصدیق کر رہا تھا۔

شاہی کنیز۔ شہنشاہ اکبر کی چاہیتی کنیز۔ اور شاہزادہ کے ساتھ دل لگی
یہ جرم ناقابل عفو تھا۔ اور اس کے لئے اب کسی دلیل وکیل اور اپیل کی
ضرورت نہ تھی۔

یہ صحیح ہے۔ کہ اکبر بڑا رحمدل تھا۔ جب جہانگیر نے شہزادگی کے
میں ایک مجرم کی کھال اتروائی۔ تو بادشاہ نے کہا۔ ہم سے تو بکرے
کھال تک بھی نہیں اتر سکتی۔ تم نے اتنا بڑا ظلم کس طرح روا رکھا۔ مگر

بھی درست ہے۔ کہ جب اس کی تیوری پر بل پڑ جاتا تھا۔ تو شاہی سیاست کے آگے کسی کی سفارش نہ چلتی تھی۔ "دربار اکبری" دیکھو اور عہد اکبری کی دوسری تاریخیں ملاحظہ کرو۔ تم کو معلوم ہوگا۔ کہ اکبر ماہم کا ادب اس لحاظ سے کہ وہ شاہی انا تھی۔ اپنی ماں سے کم نہ کرتا تھا۔ لیکن جب اس کے بیٹے ادہم خاں نے شمس الدین انگہ خاں اعظم کو بےگناہ مار ڈالا۔ تو بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ادہم خاں کو دولت خانہ کے کوٹھے سے جو چھتیس ۳۶ فٹ بلند تھا۔ سرنگوں گرا دو۔ جب اس کی لاش ماہم کے پاس گئی۔ تو اکبر خود معذرت کے لئے اس کے پاس گیا اور کہا۔ کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اسی طرح اکبر کی نظروں میں سلیم اور انارکلی کی محبت ناقابل معافی گناہ تھی۔ دونوں مجرمانِ عشق یکساں سزا کے سزاوار تھے۔ مگر سلیم شہزادہ تھا۔ ولیعہد تھا۔ لختِ جگر تھا۔ بچ گیا۔ اور انارکلی کو جرمِ الفت کی وہ سزا ملی۔ جس کی اکبر جیسے شہنشاہ سے بہت کم توقع تھی۔ وہ سزا کیا تھی۔ وہ نہایت خوفناک سزا تھی۔ "زندہ درگور" کے الفاظ سب لوگوں نے سنے ہیں۔ مرزا داغ بھی کہتے ہیں ؎

زندہ درگور زمانے میں نہ ہونگے ایسے
مرثیہ پڑھتے ہیں شاعر ترے بیماروں کا

لیکن کیا کبھی کسی کو زندہ درگور ہوتے دیکھا بھی ہے؟ انارکلی جس کے حسن و دلکشی نے بیگمات شاہی کا چراغ ماند کر رکھا تھا۔ جس کی ایک ایک ادا پر سلیم سو سو جان قربان کرنے کو تیار تھا۔ کیا اس قابل تھی۔ کہ زندہ درگور کر دی جاتی۔ مگر نوشتۂ تقدیر کون مٹا سکتا ہے۔ اکبر نے انارکلی کے زندہ زمین میں چنوائے جانے کا حکم دیا۔ شاہی حکم

کے بموجب انار کلی کو لاہور کے اُس مقام پر جہاں مقبرہ انار کلی کی عالیشان عمارت اب تک اشکِ حسرت بہا رہی ہے۔ کھڑا کیا گیا۔ اور اس کے گرد اینٹوں کی دیوار چن دی گئی۔ جہاں اُس حُسن کی دیوی نے دم گھٹ گھٹ کر جان دیدی۔ یہ واقعہ ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۵۹۹ء کا ہے۔

سلیم کو خبر ہوئی۔ دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر جب باپ کے انتقال (۱۳۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کے بعد پہلی مرتبہ لاہور میں آیا۔ تو اپنی محبوبہ کے جائے مدفن پر ایک عظیم الشان مقبرہ اور خوش وضع باغ تعمیر کیے جانے کا حکم دیا۔ جو ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۵ء میں طیار ہو گیا۔

سلیم کو انار کلی سے کس درجہ محبت تھی۔ وہ اس کے ذیل کے شعر سے جو انار کلی کی قبر کے تعویذ پر جس کے سینے پر باری تعالیٰ کے ننانوے نام لکھے ہوئے ہیں۔ درج ہے ؎

آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

یہ شعر نہیں ہے۔ ایک غمزدہ افسردہ بلکہ مردہ دل کی آہ کا دھواں ہے اُس آنکھ کا قطرۂ اشک ہے۔ جو نگہہ انتظار اور چشم شوق کے نام سے موسوم ہے۔ اور آج تھک تھک کے گر پڑی ہے۔ یہ شعر۔ یہ کتبہ۔ یہ الفاظ شہزادہ سلیم کے عشق حقیقی کا مظہر ہیں۔

قبر کے تعویذ پر جو خالص سنگِ مرمر کا ہے۔ ایسی خوبصورت اور نفیس مینا کاری کا کام ہے۔ کہ مسٹر ڈلبوٹک ایک یوروپین سیاح اس کے متعلق لکھتا ہے "یہ دنیا میں سب سے نفیس سنگ تراشی کے کاموں میں سے ہے"

اس خوبصورت عمارت کی چھت پر جس کے نیچے حسن و عشق کی زندہ تصویر

دفن ہے - ایک بہت بلند گنبد ہے - جو قدیم مغلیہ عہد کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔اس کے نیچے آٹھ بڑی محرابیں ہیں - اس گنبد کا طول مشرق سے مغرب تک ۷۵ فیٹ ۶ - انچ ہے - گنبد دو منزلہ ہے - روشندان جالی دار برجیاں کھڑکیاں - دروازے - محراب بکثرت تھے - حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس عمارت میں بھی حسب ضرورت ردّ و بدل ہوتا رہا +

مقبرہ کے باغ میں بہت سی خوبصورت عمارتیں بھی جہانگیر کے حکم سے تیار ہوئی تھیں - اس زمانہ میں دریائے راوی مقبرہ اور باغ کی دیواروں کے ساتھ بہتا تھا - دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں اس باغ اور مقبرہ کا ذکر کیا ہے - وہ حضرت میاں میرؒ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے - شہر کے جنوب کی طرف انار کلی باغ کے اس گنبد میں جو باغ مذکور کی جنوبی دیوار کے کونے میں واقع ہے - حضرت کبھی کبھی دن کے وقت جاکر آرام فرمایا کرتے تھے +

عالمگیر کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ میں بھی باغ اور مقبرہ کی عمارات اور اس کے قیمتی پتھروں پر کوئی آفت نہ آئی تھی - مگر جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۱ء میں اس مقام کو چھاؤنی بنا کر یہاں سکھوں کی چار پلٹنیں جنرل ونتورا کے ماتحت مقرر کیں - تو باغ بالکل ویران ہو گیا - بلکہ زمین صاف کر کے پریڈ گراؤنڈ بنا دی گئی - انار کلی کی قبر کا تعویذ صرف اس وجہ سے بیکار سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا گیا - کہ اس پر باری تعالےٰ کے ننانوے نام لکھے ہوئے تھے - اور وہ سکھوں کے کسی مصرف کے نہ تھے +

البتہ چبوترہ جو قبر کے تعویذ کی طرح خالص سنگ مرمر کا تھا - صحیح و سالم اُتروا کر امرت سر میں دربار صاحب کی زینت افزائی کے لئے بھیج دیا گیا +

۱۸۱۶ء مطابق ۱۸۷۳ء بکرمی میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ولیعہد شہزادہ کھڑک سنگھ کو جس کی عمر اسوقت پندرہ سال کی تھی ولیعہدی کا خلعت دینے کیلئے ایک بہت بڑے جشن کی تیاری کی۔ تو اس کیلئے مقبرہ انارکلی کا مقام ہی تجویز کیا گیا۔ جہاں پنجاب کے نامی سرداروں بلکہ جولی اور جاگیرداروں کے خیمے نصب ہوگئے۔ ہزارہا لوگ اس جشن کی رونق دیکھنے کیلئے قرب و جوار سے آئے۔ نجومیوں اور پنڈتوں نے اس تقریب کا مہورت ۱۵۔ ماگھ تجویز کیا۔ مہاراجہ نے کھڑک سنگھ کو اپنے روبرو اپنے ہاتھ سے مسندِ شاہی پر بٹھایا۔ تمام رؤساء۔ راجگان اور اہل دربار سے نذریں دلوائیں۔ اور کئی دن تک اس مقام پر ہنگامہ عیش و عشرت گرم رکھا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے جب پنجاب کا الحاق کیا۔ تو مقبرہ انارکلی کا نام سکھ افواج کے مقیم رہنے کیوجہ سے چھاؤنی انارکلی مشہور تھا۔ انگریزی حکام نے اس کی مرمت کرائی۔ اور اس مقبرہ کو پروٹسٹنٹ گرجا کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اور نام اس کا سینٹ جیمس چرچ انارکلی رکھا۔ انارکلی کی لاش زمین کھود کر باہر نکالی گئی۔ اور اُسے ایک ستون کے نیچے دبا دیا گیا۔ قبر کا تعویذ جس پر اسمائے الہیٰ کے علاوہ انارکلی کا سن وفات اور مقبرہ کا سن تعمیر بھی درج ہے۔ اب تک ایک کمرے میں بند پڑا ہے ۱۸۸۴ء یا اس کے کچھ عرصہ بعد تک یہ مقبرہ گرجا گھر کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ بعدازاں اسکی عمارت میں کچھ اور ترمیم و اصلاح کی گئی۔ اور یہاں فنانشل دفتر قائم کیا گیا۔ دفتر اب تک وہاں موجود ہے ؎

لاہور میں سب سے پہلے جو بڑا کلاک آیا۔ وہ اسی گرجا گھر یعنی مقبرہ انارکلی میں آویزاں کیا گیا۔ لاہور کے لوگ جب اسکی آواز سنتے تھے۔ اور یہ دیکھتے تھے۔ کہ وہ آواز خود بخود نکل رہی ہے تو بڑے حیران ہوتے تھے۔ یہ حالات غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر کے ہیں ؎

گوسفندِ قربانی یا شہزادہ داور بخش

شہزادہ داور بخش جہانگیر کا پوتا اور خسرو کا بیٹا تھا۔ جب جہانگیر نے ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ

کو کشمیر سے واپس آتے ہوئے بمقام چنگز (متصل راجوری) انتقال کیا۔ تو آصف جاہ اور نور جہاں یعنی بہن بھائیوں کی علانیہ عداوت نے لشکر میں تردد عظیم پیدا کر دیا۔ نور جہاں کا داماد شہریار لاہور میں تھا۔ جو عیاشیوں کی وجہ سے مختلف عوارض میں مبتلا رہتا تھا۔ نور جہاں کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی جھڑ گئے تھے۔ اُس نے لاہور میں اپنے آپ کو بادشاہ مشہور کیا۔ اور سات لاکھ روپیہ سات دن میں خرچ کر کے ایک فوج مہیا کر لی۔ آصف جاہ کا داماد شاہجہان تھا۔ جو باپ کی وفات کے وقت دکن میں تھا۔ آصف جاہ نے بنارسی نام ایک تیز رو ہندو کو اپنی مہر کی انگشتری اور زبانی پیغام دیکر دکن روانہ کیا۔ اور ادھر شاہزادہ خسرو کے بیٹے داور بخش کو زندان خانہ سے نکالکر سلطنت کی مبارکباد دی۔ اور کہا۔ کہ جسطرح ہو۔ پر لگا کر لاہور پہنچو۔ اور شہریار کا کام تمام کرو۔ داور بخش یہ سمجھتا تھا۔ کہ نور جہاں اپنے داماد کو سلطنت دلانے کی فکر میں ہے۔ اور آصف جاہ شاہجہان کے لیئے بے چین ہے۔ اسلیئے اُس نے باور نہ کیا۔ کہ آصف جاہ مجھے واقعی بادشاہ بنانا چاہتا ہے۔ شاہزادہ نے کہا میری جان سلامت رہنے دو۔ میں بادشاہی نہیں چاہتا۔ آصف جاہ نے قسمیں کھائیں اور یقین دلایا اور کہا۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئیگا۔ تخت بالکل خالی ہے۔ داور بخش اجل گرفتہ امید و بیم کے ساتھ راضی ہو گیا۔ تمام امراء آصف جاہ سے دبتے تھے۔ وہ مدار المہام کُل تھا۔ سب جانتے تھے۔ کہ یہ غریب (داور بخش) شاہجہان کیلیئے گوسفند قربانی ہے لیکن کسی نے دم نہ مارا۔ آصف جاہ نے مزید احتیاط کیلیئے تمام لوگوں کی آمد و رفت نور جہاں کیطرف بند کرادی۔ غرض جب لاہور تین کوس رہ گیا۔ شہریار نے سلطان دانیال (خلف اکبر) کے بیٹے میرزا بایسنغر کی سرداری میں دو تین ہزار فوج داور بخش کے مقابلہ پر بھیجی۔ اور آپ شہر میں تیر تقدیر کا انتظار کرنے لگے۔ پہلے ہی حملہ میں میرزا کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ شہریار کو خبر ہوئی۔ سراسیمہ ہو کر قلعہ کے اُن مکانات میں چھپ گیا۔ جہاں جہانگیر کے حرم سرا قیام کیا کرتے تھے آصف جاہ اور دیگر امراء داور بخش کی ہمراہی میں قلعہ میں داخل ہوئے۔ اُسکو تخت پر بٹھایا۔ مبارک سلامت کا چاروں طرف غل ہوا۔ اور وزارت کی باگ آصف جاہ نے اپنے ہاتھ

ہیں رکھی خسرو کی تلاش ہوئی۔ آخر فیروز خاں نام ایک خواجہ سرا خسرو کو حرم سرا سے
باہر لایا۔ اُس کے دونوں ہاتھ باندھے گئے۔ اُس کی کمر میں رسّہ ڈالا گیا۔ اور داور بخش کے
میں پیش کیا گیا۔ تسلیم و کورنش کے مراسم اس سے ادا کرائے گئے۔ الفاظ آصف جاہ کے
تھے زبان غریب داور بخش کو ہلانی پڑی تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی دن شہریار کی آنکھوں
میں داور بخش کے حکم سے سلائی پھیر کر اُسے اندھا کر دیا ۔

داور بخش بچارا تخت پر بیٹھنے اور تاج شاہی سر پر رکھنے کا گنہگار تھا۔ اندر باہر
سب جگہ آصف جاہ کی حکومت تھی۔ آصف جاہ کی اجازت کے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا
تھا۔ آصف جاہ کو رات دن شاہجہان کی آمد کا انتظار تھا۔ آخر اُس کا پیغام پہونچا۔ کہ ہمارے
آنے سے پیشتر داور بخش اور تمام شہزادوں کو صحرائے عدم میں پہونچا دو تاکہ بعد میں کسی
طرف سے کوئی کھٹکا نہ رہے ۔

چنانچہ ۲ ربیع الآخر سنہ ۱۰۳۷ھ ہفتہ کا دن تھا۔ کہ داور بخش کو تخت سے اُتار کر قید خانہ میں
ڈالا گیا۔ اور شاہجہان کا خطبہ پڑھا گیا۔ وہ آصف جاہ کو اُس کے قول و قسم اور عہد و پیمان
دلاتا رہا۔ مگر کون سُنتا تھا۔ جب خبر پہونچی۔ کہ شاہجہان آگرہ آگیا ہے۔ تو آصف جاہ نے
بدنصیب شہزادوں کو جو لاہور میں قید تھے۔ زندان سے باہر نکالا۔ اور یکے بعد دیگرے ایک
ہی دن سب کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ مآثر الامراء میں ان شہزادوں کے نام حسب ذیل
درج ہیں :۔ شہزادہ داور بخش عارضی حکمران ہند اور اس کا بھائی گرشاسپ پسران
شہریار داماد نورجہاں خلف جہانگیر۔ شہزادگان طہمورث و ہوشنگ پسران سلطان
دانیال خلف شہنشاہ اکبر۔ ان سب شہزادوں کو یہ قیامت خیز واقعہ ۲۔ جمادی الاول ۱۰۳۷
کا ہی۔ ان کے دفن کفن کے بعد آصف جاہ۔ شہزادہ دارا شکوہ۔ محمد شجاع اورنگ زیب کو لیکر جو
اسکے نواسے تھے آگرہ کیطرف روانہ ہوا۔ جہاں بتاریخ ۲۔ رجب سنہ مذکور اس نے شاہجہان
کو تخت سلطنت کی مبارکبادی دی اور یمین الدولہ آصف خاں کا خطاب حاصل کیا ۔

باغ میانیاں (چوبرجی)

زیب النساء بیگم نے اپنے دادا شاہجہان کیطرح لاہور میں ایک عالیشان باغ تیار کرایا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اپنی وسعت و لاگت اور عمارات کی خوبصورتی و نقاشی کی وجہ سے شالامار باغ سے دوسرے درجہ پر تھا۔

نواں کوٹ[1] کی چار دیواری پونچھ ہوس[2] کا وسیع احاطہ۔ کچھ حصہ خطۂ میانی کا مع باغ کی ڈیوڑھی داخلہ چوبرجی کے عقب کا تمام نشیبی حصہ جہاں زراعت ہوتی ہے۔ اور شمالی جانب کی بعض کوٹھیاں اور غربی جانب کے بعض چاہات سب اسی باغ کے حدود میں شامل تھے

---

[1] نواں کوٹ مہر محکم الدین نے جس کی مدد سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تھا۔ ۱۷۹۸ء میں یا اس کے قریب آباد کیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ موضع باغ کے عین وسط میں واقع ہے۔ نواں کوٹ میں منڈی ہر قسم کی لگتی تھی۔ اور یہ موضع خوب رونق پر تھا۔ جب مہاراجہ کی محبوبہ موراں کنجری اور مہر محکم الدین کی آپس میں مخالفت ہو گئی۔ تو مہاراجہ نے موراں کی خاطر اپنے محسن مہر محکم الدین کی جاگیر ضبط کر لی اور منڈی اس کے موضع سے اٹھا لی۔ موضع ابتک آباد ہے ۔

[2] پونچھ ہوس۔ راجہ پونچھ (کشمیر) کی کوٹھی کا نام ہے۔ جس کا بڑا دروازہ چوبرجی کی ڈیوڑھی اور جنگی خانہ کی چوکی کے متصل ہے۔ اس وسیع احاطہ کے اندر جو عالیشان بنگلہ ہے۔ وہ لارڈ لارنس پنجاب کے سب سے پہلے انگریز حاکم (بعد میں وائسرائے ہند) کی اس زمانہ کی قیامگاہ ہے۔ جب مہاراجہ دلیپ سنگھ کے زمانہ میں سکھ فوج کی تنبیہ کے لئے انگریزی فوج لاہور میں مقیم تھی۔ یہ بنگلہ پہلے سر راجہ بلدیو سنگھ والئی ریاست پونچھ ولد راجہ موتی سنگھ ولد راجہ دھیان سنگھ وزیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضہ میں تھا۔ اب اسکی وفات کے بعد راجہ سکھدیو سنگھ والئی ریاست کے قبضہ میں ہے۔

آج سے اسی[1] سال پیشتر مقام پیر مکی[2] صاحب اور متصل مکان داتا گنج بخش صاحب اس باغ کی دیوار اور اس کے متعلقہ مکانات کی بعض بنیادوں کے ٹوٹے پھوٹے آثار ملتے تھے ۔

ملتان روڈ اس باغ کے دروازے کے سامنے سے گذرتی ہے ۔ اس کا دروازہ جو چوبرجی کے نام سے مشہور ہے ۔ نقش و نگار کی وجہ سے آج سوا دو سو سال گذر جانے کے بعد بھی بالکل تازہ نظر آتا ہے ۔ دروازہ کے سب سے اوپر کے محراب پر نیلگوں حروف میں آیۃ الکرسی لکھی ہوئی ہے ۔ اس کے اختتام پر چینی کے لفظوں میں ۱۰۵۶ھ (مطابق ۱۶۴۶ء) جو باغ کی بنیاد کا سال ہے درج تھا۔ مگر اب یہ حروف بالکل مٹ گئے ہیں۔ آیۃ الکرسی کے دونوں طرف ذرا نیچے دو دو مرتبہ اللہ کا لفظ تحریر ہے ۔ بڑے محراب کے نیچے ایک چھوٹا محراب ہے ۔ جس میں چار مصرعے درج تھے ۔ اب صرف تین حسب ذیل ہیں

. . . . بنا پذیر شد ایں باغ روضۂ رضواں

بگشت مرحمت ایں باغ بر میاں بائی ز لطفِ صاحب زیبندہ بیگم دوراں

میاں بائی زیب النساء بیگم کی چاہتی کنیز تھی ۔ زیب النساء نے جب اس جگہ باغ احداث کرانا شروع کیا ۔ تو اس کا تمام انتظام و انصرام اپنی عزیز کنیز میاں بائی

---

[1] یہ نشانات مولوی نور احمد چشتی مصنف کتاب تحقیقات چشتی نے اپنی کتاب میں چشم دید لکھے ہیں ۔ اب ان کا کہیں پتہ نہیں ملتا ۔

[2] شہر لاہور سے مغرب اور مزار حضرت داتا گنج بخش سے شمال کی طرف یہ مزار واقع ہے ۔ یہ بزرگ جن کا نام جلال الدین بیان کیا جاتا ہے ۔ بعہد سلطان شہاب الدین غوری مکہ سے وارد ہند ہوئے تھے ۔ اسوقت خاندان غزنوی کا آخری بادشاہ خسرو ملک پنجاب میں حکومت کرتا تھا[3] ۔ آپ کے مفصل حالات سوانحعمری حضرت داتا گنج بخش مصنفہ راقم سے مل سکتے ہیں

کے سپُرد کیا۔ جب باغ کی تکمیل ہو گئی۔ تو شاہزادی اس کے ملاحظہ کے لئے روانہ ہوئی راستہ میں اُس نے چند لوگوں سے یہ کہتے سُنا۔ کہ شاہزادی میا بائی کا باغ دیکھنے کو جا رہی ہے۔ شاہزادی نے جب یہ سُنا۔ کہ باغ نے ایک کنیزک کے نام سے شہرت پائی ہے۔ تو اُس نے رستے ہی میں ارادہ کر لیا۔ کہ میں یہ باغ میا بائی کو دیدونگی۔ جب وہ باغ میں پہونچی اور دروازہ میں داخل ہوئی۔ تو میا بائی جھک کر آداب بجا لائی اور اُس کو درازئے عمر کی دعائیں دینے لگی۔ شاہزادی نے دروازہ سے آگے اُس وقت قدم اُٹھائے۔ جب یہ اعلان کر دیا۔ کہ میں نے یہ باغ تم کو اپنی خوشی سے تمہاری خدمات و قابلیت کی وجہ سے تمہیں بخش دیا[1] ؛

اِس عظیم و وسیع باغ کا صرف دروازہ ہی قائم ہے۔ جس کی دو منزلیں ہیں۔ اُوپر اور نیچے کئی کوٹھڑیاں ہیں۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف سنگِ مرمر کی تختی پر یہ الفاظ درج ہیں "جو شخص اس یادگار کو نقصان پہونچائیگا۔ یا اس کی تختی کو بگاڑے گا۔ اس کو قید کی سزا دی جائیگی۔ جس کی میعاد تین ہفتہ ہو سکتی ہے۔ یا اُس پر جُرمانہ کیا جائیگا۔ یا قید اور جُرمانہ دونوں سزائیں دی جائینگی" یہ الفاظ گورمکھی۔ اُردو۔ انگریزی میں تحریر ہیں ؛

باغ کی چاردیواری نہایت مضبُوط اور چُونہ گچ تھی۔ جب دریا کی شورش انگیز لہریں چاردیواری آ پہونچیں۔ تو نہ صرف چاردیواری بلکہ باغ کے اندر کی شاندار عمارتیں بھی مسمار ہو گئیں۔ یہاں تک کہ اب صرف ڈیوڑھی کا دروازہ جس کا

---

[1] از تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ جج محمد لطیف بحوالہ شاہجہان نامہ ؛

نام چوبرجی ہے باقی رہ گیا ہے ÷

سنہ ۱۸۴۳ء میں اس کے چاروں مینار موجود تھے۔ مولوی نور احمد چشتی جو اس زمانہ میں زندہ تھے لکھتے ہیں۔ ایک مینار ہمارے دیکھتے دیکھتے مسمار ہو گیا۔ نشان اس مسمار شدہ برجی کے موجود ہیں۔ اب صرف تین مینار باقی ہیں۔ سرکار نے اس کے گرد لوہے کا جالی دار تار لگا کر باغ کے ان آثار قدیمہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس باغ کی دیوار جس کو اب چوبرجی کہتے ہیں ملتان روڈ پر قلعۂ لاہور سے دو میل کے فاصلہ پر ہے ÷



بیگم پورہ (لاہور)

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

لاہور عہد قدیم سے نامور شہر چلا آتا ہے۔ مگر جو عظمت و شہرت اور وسعت و دولت اس کو عہد مغلیہ اور خصوصاً عروج مغلیہ کے ایام میں نصیب ہوئی ہے۔ اس نے اس کی اہمیت بہت بڑھا دی۔ اکبر ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک یعنی ۱۵ سال کامل لاہور ہی میں رہا ہے۔ اس کا نامور پوتا شہنشاہ شاہجہان ۱۰۰۰ھ میں لاہور ہی میں بموجودگی اکبر پیدا ہوا۔ اکبر نے اور اس کی تقلید میں اس کے وزرا و امرا نے لاہور میں عالی شان باغات اور فلک رفعت مکانات "بیرون شہر" تعمیر کرائے۔ لاہور کا مشہور بیت الخلا قلعہ اکبری دروازہ اور اکبری منڈی ابھی تک اکبر کی یادگاریں لاہور میں موجود ہیں

لاہور میں ایک محلہ مغلپورہ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ سے آباد چلا آتا تھا۔ یہ بستی بیرون شہر ان لوگوں نے آباد کی تھی۔ جو ترک وطن کر کے لاہور آ گئے تھے۔ اسی زمانہ سے اب تک اس کا نام مغلپورہ مشہور چلا آتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں جب مغلوں کا عروج ہی عروج تھا۔ اس محلہ کے نصیب جاگے اور یہاں نامور درباری لوگوں نے اپنے محلات اور باغ باغیچے

کرائے۔ اسی مغلپورہ میں بعہد شہنشاہ جہانگیر حضرت خواجہ خاوند محمود المشہور حضرت ایشاں نے کشمیر سے تشریف لاکر خانقاہ مسجد اور باغ کی عمارتیں تعمیر کیں۔ اور اسی محلہ میں ۱۰۵۲ھ میں بعہد شاہجہان وفات پائی۔

عالمگیر کی حکومت کا آخری مگر طویل حصہ مہمات دکن میں صرف ہونے بلکہ وہیں وفات پا جانے کی وجہ سے لاہور یں گو ناظمان لاہور موجود رہتے تھے۔ اور ان کے دیوان اور وزیر۔ دربار کی سب قسم کے لوگ موجود تھے۔ مگر جو رونق بادشاہی امرا و زرا کی آمد و رفت کی وجہ سے لاہور خصوصاً مغلپورہ میں رہتی تھی وہ عنقا ہوگئی۔ عالیشان حویلیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور باغوں اور خیابانوں پر اداسی و افسردگی کا عالم تھا۔

فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں لاہور کی گورنری پر نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ فائز تھا۔ وہ چونکہ حضرت ایشاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی اقامت روضہ حضرت ایشاں کے قریب میں پسند کی۔ اس کی بیگم کا نام بیگم جان تھا۔ اس نے ۱۱۳۹ھ میں مغل پورہ اور اور اس کے ملحقہ محلہ تہل پورہ کی زمین پر خوبصورت مکانات تعمیر کرائے۔ اور ایک باغ اور ایک خوشنما مسجد سے انکی رونق دی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ مغلپورہ کی جگہ اب لوگوں کی زبان "بیگم پورہ" کے نام سے آشنا ہو رہی تھی۔

بیگم پورہ کے مکانات ایک قسم کا گورنمنٹ ہوس تھے نواب

عبدالصمد خاں کے زمانہ سے لیکر آخری مسلمان گورنر نواب میر معین[1] الملک کے زمانہ تک بیگم پورہ کی آبادی اور رونق روزبروز بڑھ رہی تھی۔ ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر اپنا پہلا حملہ کیا ہے۔ اور نواب عبدالصمد خاں کے پوتے شاہنواز خاں (بن زکریا خاں) ناظم لاہور کو شکست دی ہے۔ تو صرف اسی مغلپورہ اور بیگم پورہ نے اہل لاہور کو احمد شاہی لوٹ سے بچایا تھا۔ تاریخ لاہور[2] میں لکھا ہے۔ "تمام فوج ایک ہی دن کی لوٹ میں اس قدر مالامال ہو گئی تھی۔ کہ اس کو لاہور کے لوٹنے کی مطلق خواہش نہ رہی[3]۔ علاوہ لوٹ اور غارتگری کے بیگم پورہ میں ابدالی فوج نے دردناک قتل عام بھی کیا

سہ حاکمان لاہور[4] کے زمانہ (۱۷۶۵ء لغایت ۱۷۹۸ء) میں سکھ غارتگروں نے تین مرتبہ اس محلہ کو بے چراغ کیا۔ دُرانی

---

[1] اسکے زمانہ میں سکھ غارتگروں کا بڑا زور رہا اس لئے انکی دقعی گوشمالی کی سکھ اسکو میر منو کہتے تھے۔ انکا ایک شعر نواب میر منو کے متعلق مشہور ہے

میر منو ساڈی دا تری اسی منو دے سوٹے
جیوں جیوں سانوں وڈھدا اسی دُونے دُونے ہوئے

[2] مصنفہ رائے بہادر کنہیا لعل مطبوعہ ۱۸۸۴ء

[3] احمد شاہ کی اسی لوٹ کے متعلق لاہور میں یہ پنجابی ضرب المثل مشہور ہے

کھادا پیتا لاہے دا   رہندا احمد شاہے دا

[4] لہنا سنگھ، گوجر سنگھ (جسکے نام پر محلہ گوجر سنگھ آباد ہے) سوبھا سنگھ (درانی سکی یادو

افغانی فوجوں نے مکینوں کو لوٹا تھا۔ مگر مکانوں سے سروکار نہ رکھا تھا۔ سہ حاکمان لاہور اور ان کے جانشینوں نے بھی بچی کھچی دولت اور رہی سہی پونجی پر ہاتھ صاف کیا۔ لیکن جب رنجیت سنگھ ۱۷۹۸ء لغایت ۱۸۳۹ء کا عہد آیا۔ تو مکانات و محلات کی دیواریں اور بنیادیں تک ہل گئیں۔ تاریخ لاہور میں لکھا ہے۔ ناظمان لاہور کی زنانہ و مردانہ قبر دلی پر لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تھیں۔ جن پر سنگ مرمر کے علاوہ اور قیمتی قسم کا قیمتی پتھر لگا ہوا تھا۔ رنجیت سنگھ نے تمام پتھر اتروا لیا

جب ۱۸۴۹ء میں انگریزی عہد آیا۔ تو بیگم پورہ کی جو دیواریں اور بنیادیں سکھوں کی دست برد سے بچ رہیں وہ محکمہ نزول میں منتقل ہوگئیں۔ اور نیلام ہو کر میاں محمد سلطان ٹھیکہ دار کے ہاتھوں نیست و نابود ہوگئیں۔

ناظمان لاہور کا قریباً تمام خاندان بیگم پورہ ہی میں مدفون ہے۔ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ ناظم اول۔ اس کے دو بیٹے نواب ذکریا خاں۔ اور نواب عبداللہ[1] خاں دونوں نے یکے بعد دیگرے بیگم پورہ ہی کو دارالحکومت بنایا۔ ان کے بعد نواب ذکریا خاں کا بیٹا نواب شاہنواز خاں بھی بیگم پورہ ہی میں رہا۔ اور ہر ناظم نے جو اس زمانہ میں حفظ سلطنت کی وجہ سے بجائے خود

---

[1] یہی نواب عبداللہ کے متعلق مشہور ہے "در حکومت نواب عبداللہ نہ چکی بہی نہ چولہا" وفات ۱۱۶۶ھ قبر اسکی مقبرہ سر دوالا اور بیگم پورہ کے مشرق کی طرف ہے

پنجاب کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا بیگم پورہ کو بہت رونق دی۔
رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کے ایک فوجی افسر مہاں سنگھ خزانہ نے اجڑے ہوئے بیگم پورہ کے گرد بہت سے درخت رکھ اور جنگل کے طور پر لگا دئیے۔ اور یہ جگہ جہاں آبادی کی چہل پہل سے کھوے سے کھوا چھلتا رہتا تھا۔ جہاں دولت کا ہن برستا تھا اور جہاں عالیشان عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ ایک بیلہ سی نظر آنے لگی۔ مہاں سنگھ خزانہ نے بھوگیوال اور باغبانپورہ کے چند زمینداروں کو بیگم پورہ کے کھنڈرات پر آبادی و زراعت کا حکم دیا۔ چنانچہ بہت سے کھنڈرات صاف ہو کر قابل زراعت زمین پیدا ہو گئی۔ خزانہ کے بعد مہاراجہ حکم سے گلاب سنگھ بھونڈیہ نے خاص بیگم پورہ میں اپنا توپ خانہ قایم کیا۔ تمام درخت وغیرہ کٹوا دئیے۔ اور اس مسجد کو جس کے لبنتی۔ سبز اور کاسنی رنگ کے نقش و نگار دو سو سال گذر جانے اور کئی صدمات دیکھنے کے بعد بھی خوشنما اور تر و تازہ معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی آرام گاہ قرار دیا۔ اس وقت وہ جگہ جو پہلے مغلپورہ اور پھر بیگم پورہ کے نام سے مشہور رہی۔ اب "چھاؤنی گلاب سنگھ بھونڈیہ" کے نام سے شہرت پذیر تھی۔ مسجد ابتک موجود ہے۔ درمیانی محراب کی پیشانی پر وسط میں " افضل الذکر لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ " شمال کی جانب "عملو بالصلوۃ قبل الموت " اور جنوب کی سمت " عملو بالصلوۃ قبل الموت " لکھا ہے۔ مسجد کا منبر سنگ مرمر کا تھا۔ اب سنگ مرمر کی جگہ سفید چونے نے لی ہے۔ مسجد کے سامنے ہی اس باغ کے آثار

بھی نظر آتے ہیں۔ جو بیگم پورہ کی بنا کے ساتھ ہی نواب بیگم جان نے آباد کیا تھا۔

جب راجہ سنسار چند کوہستان کانگڑہ سے اسیر ہو کر لاہور آیا۔ تو رنجیت سنگھ نے بیگم پورہ اس کی جاگیر میں کر دیا۔ ۱۸۲۵ بکرمی میں۔ جس کو آج ۱۰۶ سال کا عرصہ گزرتا ہے۔ راجہ سنسار چند نے یہ گاؤں اپنے برہمنوں کو بخش دیا۔ اس زمانہ میں اسکا مانیہ ایک سو روپیہ سالانہ تھا۔

لہنا سنگھ مجیٹھہ سکھوں کے زمانہ میں ایک نامی سردار تھا۔ اس کے بیٹے دیسہ سنگھ نے کوہستان میں برہمنوں کو ایک سو روپیہ کا گاؤں دیکر بیگم پورہ پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اور وہ شاہی محلات وہ عالیشان مسجد وہ پُر بہار باغ۔ بیگم پورہ کی وہ فصیل اور چار دیواری جس کے غرب رویہ ایک وسیع بازار تھا۔ جہاں اس قدر دولت تھی۔ کہ درانی فوجوں نے یہاں کی لوٹ کے بعد لاہور کو لوٹنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک سو روپیہ کی ذلیل قیمت پہ دست بدست فروخت ہو تا گیا

ڈیوڑھی (بیگم پورہ) کا عالیشان دروازہ اس قدر بلند ہے کہ ہاتھی معہ ہودج بڑی آسانی سے اس میں گزر سکتا ہے دروازہ کے چوبی طاق جو لوہے کی کثرت سے حملہ دشمن کے لئے ڈھال کا کام دیتے تھے۔ سکھا شاہی زمانہ میں "بدست بچنگاں" کی نذر ہو گئے۔

نواب غازی نواب عبداللہ ناظم لاہور کا پوتا جو مغلوں کی الٰی انتہا

اور سکھوں کے خوف کی وجہ سے کہیں باہر چلا گیا تھا۔ سکھوں کے دور آخر میں لاہور آیا۔ خاص شہر میں آبا و اجداد کے کچھ مکانات تھے۔ کچھ عرصہ تک ان کی ہڈیاں بیچ بیچ کر گزارہ کرتا رہا۔ جب سرکار انگریزی کا عمل دخل ہوا۔ تو بیگم پورہ کی ملکیت کا دعوے کیا۔ مگر اپنی بے زری و مفلسی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اسی حسرت میں ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں یعنی غدر ۵۷ء سے ایک سال پیشتر مر گیا۔

اب اس موضع پر مہر قادر بخش کا قبضہ ہے۔ اور اس کا سالانہ مالیہ چار پانچ روپیہ کے قریب ہے۔ مردم شماری ڈیڑھ سو آدمیوں کی ہے۔ اور یہ سب لوگ بیگم پورہ کی ٹوٹی پھوٹی فصیل اور اس کی شکستہ عمارت کے اندر رہتے ہیں

بیگم پورہ اور اس کے کھنڈرات شالا مار باغ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر روضہ حضرت ایشاں کے قرب میں واقع ہیں یہ عمارتیں سڑک شالا مار باغ سے صاف نظر آتی تھیں۔ اب پنجاب ٹیکنکل کالج کی وسیع و کثیر عمارات نے ان کو نظر دل سے بہت کچھ او جھل کر دیا ہے۔

ملکۂ لاہور

نواب معین الملک عرف میر منو (داماد نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ) محمد شاہ کی طرف سے ۱۷۴۷ء میں پنجاب کا صوبیدار مقرر ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے وہ نہایت تندہی اور شجاعت سے روکتا رہا۔ لیکن ۱۷۵۲ء میں رسد رسانی کی قلت سے تنگ ہو کر اس نے احمد شاہ کے ساتھ شالامار باغ میں صلح کی شرایط طے کیں۔ اور پچاس لاکھ نقد اور کچھ ہاتھی گھوڑے معہ ساز و سامان دیگر سوا لاکھ کا خلعت لیا۔ اور جالندھر۔ لاہور اور کوہستان کی سند حکومت حاصل کی۔

اس زمانہ میں سکھوں کی غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ رعایائے پنجاب ان ناخدا ترسوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھی۔ میر منو ان کی گوشمالی اور سرزنش کے لیے قصور کی جانب روانہ ہوا۔ اور ان کو وہ سزا دی۔ کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخیں ان خونی اوراق سے بھری پڑی ہیں۔ وہ فتح یابی کے بعد ایک دن شکار کو جا رہا تھا۔ کہ گھوڑی سیخ پا ہو گئی۔ اور اس طرح بھڑکی۔ کہ نواب کی جان عزیز اسی صعوبت میں قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۱۷۵۴ء کا ہے

میر منو کا ایک لڑکا امین الدین خاں اس وقت تین سال کا تھا۔ اس کی ماں مراد بیگم نے سکھوں کی لوٹ مار اور احمد شاہ

بادشاہ دہلی کی پست ہمتی کے واقعات اپنے امرا کو بتا کر اپنے ساتھ ملا یا۔ اور بیٹے کو حکومت پنجاب کا والی قرار دیکر آپ اسکی سرپرست بنی۔ قدرت سے چھ ماہ بعد وہ لڑکا بھی چیچک سے انتقال کر گیا اب مراد بیگم کے لئے بڑی مشکل تھی۔ نہ وہ حکومت چھوڑ سکتی تھی۔ اور نہ اسے اپنے حکمران رہنے کی کوئی صورت نظر آتی تھی

نواب قمرالدین خان وزیر کی بیٹی تھی۔ محلوں میں پلی تھی ان چالوں سے واقف تھی جن سے بادشاہ تخت پر بٹھائے جاتے اور اُتارے جاتے ہیں۔ لکھی پڑہی تھی۔ اپنے بیٹے کی سرپرستی کے زمانہ میں بعض احکام اپنے ہاتھ سے لکھتی تھی۔ نہایت معاملہ فہم اور زیرک تھی۔ اس لئے بیٹے کی موت سے جو پریشانیاں لاحق ہوگئی تھیں۔ ان کے باوجود بھی اس نے اپنے رعب داب اور شاہانہ تجمل میں فرق نہ آنے دیا۔ امرائے دربار کو اس نے بلایا اور سمجھایا۔ کہ میں عورت ذات۔ پردہ میں بیٹھنے والی ہوں۔ برائے نام مجھے اپنا حکمران بنالو۔ تاکہ نواب مرحوم کے گھر کی عزت بنی رہے حکم احکام در اصل تم ہی لوگوں کے ہونگے۔ اگر کوئی اور صوبیدار آگیا۔ تو خدا جانے تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ امرا نے بھی سمجھا کہ بیگم بات ٹھیک کہتی ہے۔ عمل و دخل سب ہمارے ہی قبضہ میں رہیگا۔ اس کو برائے نام حکمران سمجھنے میں ہمارا کیا حرج ہے۔ غرض اس طرح تو اس نے اپنے شوہر کے امراء و رفقاء کو اپنی رفاقت میں رکھا۔ اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی۔ اور اس کے ہمنام مگر پست ہمت بادشاہ دہلی احمد شاہ تیموری کے

درباروں میں نہایت خفیہ طور پر اپنے وکیل اور ایلچی بھیجے تاکہ باضابطہ سند حکومت ملنے پر مجھے امرائے دربار کا محتاج نہ رہنا پڑے۔

لاہور اس زمانہ میں دو ملاؤں میں ایک مرغی کی مثال تھا۔ احمد شاہ درانی کو فاتح ہونے کی حیثیت سے لاہور پر دعوے تھا اور احمد شاہ تیموری اسے اپنا موروثی ملک سمجھ رہا تھا۔ احمد شاہ درانی نے تو اس خیال سے مراد بیگم کو سندِ حکومت لکھ دی کہ اس کے شوہر نواب معین الملک نے میری اطاعت قبول کر لی تھی اور احمد شاہ دہلی نے اس لئے پروانہ لکھ دیا کہ وہ اپنے آپ کو دربار دہلی کے ماتحت سمجھ رہی ہے یہی غنیمت ہے

غرض۔ اس ہشیار عورت نے دونوں درباروں سے عطائے حکومت کے فرمان حاصل کر لئے۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ پاؤں اچھی طرح جم گئے ہیں۔ اور حکومت نے اقتدار حاصل کر لیا ہے تو اس نے بعض امور میں امرائے دربار کا دخل کم کرنا شروع کر دیا اور کوئی حاکم یا امیر اپنے سابقہ اختیارات سے کوئی حکم جاری کرتا۔ تو بیگم اس کو فوراً منسوخ کر دیتی۔ اور اس پر سختی سے نوٹس لیتی۔

امراء نے اپنی یہ ذلت دیکھکر بیگم کے خلاف وسیع پیمانہ پر ایک سازش کی۔ جس میں یہ قرار پایا کہ بیگم کو تخت لاہور سے اُتار کر اپنے گروہ میں سے کسی کو حاکم لاہور بنالیں۔ اور بادشاہ کو اس واقعہ کی دہلی میں اطلاع دیدیں۔ ابھی یہ سازش عالم وجود میں نہ آئی تھی۔ کہ بیگم کو خبر ہو گئی۔ اس نے بظاہر تو

کسی کو کچھ نہ کہا۔ لیکن ان امراء کو وہ سزا ضرور دینا چاہتی تھی۔ اس لیئے اس نے احمد شاہ ابدالی کے پاس اپنے ایلچی بھیجے۔ اور ایک مفصل عریضہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ کہ میرے شوہر کے امراء دربار مجھے عورت ذات سمجھکر میری جان کے درپے اور اپنے میں سے کسی کو پنجاب کا خود مختار بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نہایت شکرگزار ہونگی۔ اگر بادشاہ اپنے دربار کا کوئی قابل اور معتمد اہلکار میری حفاظت اور میری نیابت کے لیئے کابل سے روانہ کردے۔ احمد شاہ ابدالی نے دربار کابل کے ایک نامی امیر سردار جہان خاں کو کچھ فوج دیکر بیگم کی نیابت میں کام کرنے کے لیئے لاہور روانہ کر دیا۔

جہان خاں کے آنے پر بیگم نے امراء کا زور اور بھی کم کرنا شروع کر دیا۔ نواب میر بھکاری خاں رستم جنگ بانی مسجد طلائی لاہور۔ سے جو بیگم کے دربار کا امیر الاعظم تھا۔ بیگم بہت خائف تھی۔ کیونکہ شہر میں اس کا رسوخ و اقتدار حد درجہ کا تھا۔ اور مدار المہامی کا عہدہ بھی اسی کے سپرد تھا۔ بیگم نے کسی بہانہ سے اسکو محلات میں بلوایا۔ اور جہان خاں کے روبرو اس کی کمال بے عزتی کرکے اپنی لونڈیوں کے ہاتھ سے اسے سولی دلوا دی۔

دار الخلافہ کے امیر الامراء اور پنجاب کے مدار المہام یہ کیفیت دیکھکر تمام امیروں کے کان کھڑے ہوگئے۔ اور سب نے سرکاری امور میں دخل دینا چھوڑ دیا۔ اور خانہ نشینی اختیار کرلی۔

امراء کی خانہ نشینی یا خاموش مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکھوں

نے پھر پرپرزے نکالے۔ وہ علاقوں کے علاقے لوٹ لیتے زمینداروں سے معاملہ تک زبردستی وصول کرلیتے۔ جہاں خاں بہت کچھ انتظام کرتا۔ مگر اس کی تمامینیت فوجی کاموں تک ہی محدود تھی۔ انتظامی اور مالی امورات کی انجام وہی بغیر اہلکاروں کے مشکل تھی۔ اور وہ سب جان و آبرو کی حفاظت کے لئے اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے تھے۔ ملک کی بدانتظامی اور سکھوں کی لوٹ مار کے متعلق امرائے خانہ نشین نے آخر ایک عریضہ بادشاہ دہلی (احمد شاہ تیموری) کی خدمت میں لکھا۔ بادشاہ نے غازی الدین خاں اپنے وزیر کو جو نظام اول دکن کا پوتا تھا۔ کچھ سپاہ دیکر لاہور بھیجا۔ وہ ابھی جالندھر کے علاقہ ہی تھا۔ کہ مراد بیگم نے پوشیدہ طور پر اپنا ایک وکیل وزیر موصوف کے پاس روانہ کیا۔ اور یہ پیغام بھیجا۔ کہ اگر پنجاب کی حکومت میرے نام واگذار ہے۔ تو میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے کردونگی۔ چنانچہ وزیر کی منظوری کے بعد مراد بیگم اپنی بیٹی۔ لشکر اور سامان کے ساتھ لاہور سے روانہ ہوگئی۔ اس وقت وزیر (غازی الدین خاں) ماچھی واڑہ میں مقیم تھا۔ اسی جگہ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ اور دو ماہ تک وزیر دلہن کے ساتھ اسی مقام پر عیش و عشرت میں مصروف رہا۔

غازی الدین خاں واپس دہلی جاتے ہوئے اپنا ایک معتبر افسر

ل۵ مراد بیگم رشتہ میں وزیر غازی الدین خاں عماد الملک کی پھوپھی تھی

سید جمیل الدین نامی بیگم کی نیابت میں چھوڑ گیا۔ بیگم کی یہ کیفیت دیکھکر جہان خاں احمد شاہ ابدالی کا معتبر لاہور چھوڑ کر کابل چلا گیا تھا جمیل الدین اپنا اقتدار چاہتا تھا۔ اور بیگم اپنے مقابلہ میں کسی اور اقتدار ایک آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ آخر دونو میں اَن بَن ہو گئی۔ بیگم نے اپنے داماد غازی الدین سے جمیل الدین کی شکایت کی مگر اس نے چنداں پروا نہ کی۔ بیگم نے مایوس ہوکر احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی کا یہ چوتھا حملہ جو لاہور اور پنجاب پر ہوا ہے۔ وہ اسی بیگم کی دعوت کا نتیجہ تھا۔

دہلی میں جب بیگم کی اس سازش کا حال معلوم ہوا تو غازی الدین خاں نے مرزا آدینہ بیگ حاکم جالندھر کو لکھا۔ کہ کسی ترکیب سے بیگم کو گرفتار کر کے دہلی بھجوا دو۔ اپنے چند سردار بھی لاہور بھیجے کہ وہ خفیہ طور پر اپنے مقصد کی تکمیل میں لگے رہیں۔ آخر لونڈیوں اور خواجہ سراؤں کی معرفت اس وقت جبکہ بیگم خواب استراحت میں تھی۔ گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دی گئی۔ بیگم نے اپنے گرفتار کنندگاں اور نواب آدینہ بیگ وغیرہ کو کہا۔ کہ جب احمد شاہ کو میری گرفتاری کا حال معلوم ہوگا۔ تو یاد رکھو۔ ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیگا۔ اور ہر طرف خون کی ندیاں بہتی نظر آئینگی۔ لیکن ایسے وقت میں ایسی باتیں کون سنتا ہے۔ چنانچہ بیگم تو دہلی پہنچا دی گئی۔ اور آدینہ بیگ کو اس خدمت کے صلہ میں غازی الدین نے لاہور کا صوبیدار مقرر کر دیا۔

اس واقعہ کے تھوڑے دنوں کے بعد غازی الدین خاں عماد الملک

نے مولویوں اور مفتیوں سے بادشاہ کی معزولی کے فتوے لکھوا کر احمدؔ شاہ کو تخت سے اُتار دیا۔ اور شہزادہ محمدؔ معزالدین کو عالمگیر ثانی کا خطاب دیکر بادشاہ نامزد کر دیا۔

جب مراد بیگم کا رقعہ دعماد الملک غازی الدین وزیر شاہ دہلی کی زیادتیوں کا) احمدؔ شاہ ابدالی کو ملا۔ تو وہ مہم قندھار میں معروف تھا۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ عازم پنجاب ہوا۔ اور ۱۷۵۶ء کے موسم سرما میں لاہور پہنچ گیا۔ اس وقت دہلی میں عالمگیر ثانی۔ اور لاہور میں نواب آدینہ بیگ[1] کی حکومت تھی۔ آدینہ بیگ بھاگ گیا

---

[1] لاہور پر ۱۷۵۸ء میں کچھ عرصہ کے لئے مرہٹوں کا قبضہ بھی ہو گیا تھا مرہٹے ادھر ملتان تک اور سرحد کی طرف اٹک تک حکومت کرتے تھے۔ سکھ کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اور دُرّانی ہٹتے ہٹتے اٹک پار چلے گئے تھے مرہٹوں کے زمانہ میں بھی آدینہ بیگ ہی پنجاب کا صوبہ دار مقرر ہوا آخر مرہٹے اس سے ۷۵ لاکھ نذرانہ لیکر دکن کو واپس چلے گئے۔ نواب آدینہ بیگ نے بڑھاپے میں بہت عروج حاصل کیا۔ وہ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ صوبہ پنجاب کا زمانہ دیکھے ہوئے تھا۔ اس کا پنجاب پر بڑا اثر تھا۔ افسوس ہے۔ کہ وہ اپنا اقتدار زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ سکا۔ اور ۱۷۵۸ء ہی انتقال کر گیا۔ آدینہ نگر (موجودہ نام دینا نگر) جو ضلع گورداسپور میں ہے۔ اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس کی قبر گوجرانوالہ میں بتائی گئی ہے (تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف)

اور بادشاہ نے سیدھا دہلی کا رُخ کیا۔ جب دہلی بیس میل رہ گئی تو غازی الدین بہت گھبرایا۔ اس اضطراب و پریشانی میں اپنی ساس اور پھوپھی مراد بیگم کی یاد آئی۔ گو وہ عزت کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر بادشاہی اسیروں میں تھی۔ مراد بیگم سے غازی الدین نے کوئی اچھا سلوک نہ کیا تھا۔ تاہم یہ وقت ایسا تھا۔ کہ اسے مجبوراً اس کے پاس جانا پڑا۔ اور اس کی منت خوشامد کر کے احمد شاہ دُرّانی کے دربار میں اس کو اپنا وکیل و شفیع بنایا۔ چنانچہ بیگم کی سفارش سے اس نے اپنی تقصیر بھی معاف کرالی۔ اور بحالی عہدہ کے علاوہ اپنی قدر و منزلت بھی پہلے سے زیادہ بڑھالی

اسی حملہ میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو دو ماہ تک لوٹا۔ اور محمد شاہ کی بیٹی سے اپنی۔ اور اس کی ایک بھتیجی سے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی کردی۔ اس واقعہ کے بعد تاریخ میں مراد بیگم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دہلی میں گمنامی کی حالت میں انتقال کرگئی تھی۔

مکمل تاریخ کشمیر (عہد اسلامیہ) جس میں

سلاطین کشمیر کے جلیل القدر عہد
حکومت کو بہ وضاحت قلمبند کر کے
۵۰۰ سالہ اسلامی عہد حکومت کی
مفصل تاریخ درج کیگئی ہے۔ کشمیر
عروج و زوال کا یہ صحیح مرقع آپکو
بتا دیگا۔ کہ کشمیر میں اسلام کسطرح
پھیلا۔ کس طرح بڑھا۔ اور کس طرح
تخت و تاج اس کے قبضے میں آیا
اور پھر کیا اسباب تھے۔ کہ وہ لوگ
جو اپنے ملک (کشمیر) سے باہر نکل کر
ہندوستان۔ لنکا ماورالنہر کاشغر
اور تبت و چین تک مار دھاڑ کرتے
تھے۔ اس قابل بھی نہ رہے۔ کہ
ممالک غیر کی فتوحات تو کجا اپنے
ملک کی حفاظت ہی کر سکتے (حکومت
سکھاں) اس حصہ میں سکھوں کی
۲۷ سالہ حکومت کشمیر کا ذکر ہے جسمیں
مسلمانوں کے ساتھ حیوانوں سے بھی
بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ
تھا۔ کہ کوئی مسلمان آزادی و جرأ
کے ساتھ احکام شریعت کی بجا آ
بھی نہ کر سکتا تھا۔ سکھ حکومت کی
باہمی سازشیں اور خانہ جنگیاں ا
بھی قابل عبرت ہیں۔ قیمت ہر
حصہ عہ حجم ۴۴۰ صفحہ مجلد

غنی کاشمیری ملک الشعرا مخبر کشمیر

علامہ محمد طاہر غنی کاشمیری وہ
حریت پسند شاعر تھا۔ جس نے
کبھی کسی بادشاہ و وزیر یا رئیس
کی خوشامد نہ کی اور پھر بھی بادشا
اور گورنر قدر کرتے تھے یہ عدیم النظ
شاعر شاہجہان کے زمانہ میں ہوا
ہے۔ اس زمانہ کی فارسی شاعری
اور علامہ غنی کے دلچسپ حالات کے
علاوہ ہمعصر شعرا کا تذکرہ بھی بڑا
دلچسپ ہے۔ مولفہ مولانا اکبر شاہ
خاں صاحب نجیب آبادی۔
قیمت آٹھ آنہ (۸ر)

دو بیارزہ

دربار اکبری کے مشہور ظریف
بیارزہ کی سوانحعمری اور راجہ
سے اس کی دو دو چونچیں عجب
طف کتاب ہے۔ قیمت ۴ر

وطن خواتین ہند

جس میں ۳۲
مسلمان سکھ اور پارسی محب وطن
ین ہند کے حالات سوانحات
ور ملکی جذبات سے لبریز خیالات
انگیز اور موثر پیرایہ میں درج
جنہوں نے اپنے ملک وملت کو
ی سے ابدی نجات دلانے کے
ر مصیبت ہر مشکل اور ہر تکلیف میں
ت تصور کی ہے۔ بلکہ اپنے بھائیوں
ں اور خاوندوں کے جیل میں جانے
ن کے زبان بند و نظر بند ہونے کو
ی دائمی آزادی کا ذریعہ سمجھا ہے
. . . . . . (۸ر)

زاغلول پاشا

جس میں مشہور مصری محب
رئیس الاحرار مصر سعد زاغلول پاشا
ی و قومی خدمات کے کارنامے اور
اس کی پولیٹیکل زندگی کے حیرت انگیز واقعات
عربی پاشا محمدؐ بک فرید عبداللطیف بک
اور شیخ محمدؐ عبدہ جیسے فداکاران ملت
اور بیگم زاغلول پاشا (صفیہ خانم) جیسی
آزادی حق گو اور جوان ہمت و شیر دل عورت
کی جانبازانہ جدوجہد کے علاوہ سیاسیات
مصر کے متعلق بھی دلچسپ کوائف درج
ہیں۔ قیمت . . . . (۱۰ر) دس آنہ

غنی کاشمیری

فخر کشمیر و ہند ملک الشعرا علامہ
محمدؐ طاہر غنی کاشمیری وہ حریت پسند
شاعر تھا۔ جس نے کبھی کسی بادشاہ وزیر
یا رئیس کی خوشامد نہ کی اور پھر بھی بادشاہ
اور گورنر قدر کرتے تھے۔ یہ عدیم النظیر
شاعر شاہ جہان کے زمانہ میں ہوا ہے۔
اس زمانہ کی فارسی شاعری اور علامہ غنی
کے دلچسپ حالات کے علاوہ ہمعصر شعرا کا
تذکرہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ (مولفہ مولانا
اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی۔
قیمت . . . . . . (۱ر)

ملنے کا پتہ: ظفر برادرس
تاجران کتب ظفر منزل لاہور

مکمل تاریخ لاہور

اس کے مندرجہ ذیل پانچ حصے ہیں۔ لاہور قدیم جسمیں لاہور کی ابتدا ۔ اسکی وجہ
قدیم ہندو راجگان لاہور کے حالات ۔ غزنویوں اور غوریوں اور انکے بعد کے مسلمان بادش
کی حکومت ۔ ان حکومتوں کا پنجاب اور لاہور پر اثر ۔ زیر طبع ۔ قیمت ۸ / ۔ حصہ دوم شباب
(یا لاہور عہد مغلیہ میں) بابر سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ یعنی سوا دو سو سال تک لاہور کے
باغات و عمارات ۔ اندرون و بیرون شہر کی رونق ۔ آبادی اور کثرت محلہ و فارغ البا
سے جو عروج و شباب حاصل رہا ہے ۔ ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کے علاوہ اکبر جہانگیر شاہجہان اور
اور شاہ عالم بہادر شاہ ۔ جسکے نام پر شاہ عالمی دروازہ اب تک قائم ہے ۔ لاہور کو عر
بنانے میں جو بہا دلچسپی کا اظہار کیا ہے ۔ اسکی مفصل کیفیت عہد مغلیہ کے عدل و انصاف اور مح
گورنران لاہور کے دلچسپ آئین (اس زمانہ کے علما شعرا امرا وزراء اور شہزادوں کے حا
قیمت صرف عہ ۔ زوال لاہور ۔ شاہ عالم اول کے بعد دولت مغلیہ کے زوال کے سا
ہی یہ ترقی لاہور کا کمال بھی ختم ہو گیا ۱۷۳۹ء یا نادر شاہی حملہ سے لیکر مہاراجہ رنج
کے قبضہ لاہور (۱۷۹۸ء) تک سکھوں ۔ ابدالیوں اور کابلیوں نے لاہور میں جو غارتگری
اور یہ رونق شہر کی آبادی پر جو ستم ڈھایا ہے ۔ اسکی دردناک کیفیت ۸ / حصہ چہارم لاہور
سکھوں کی حکومت ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد (۱۷۹۸ء) سے لیکر ۱۸۴۹ء یعنی زمانہ ا
پنجاب تک کے حالات ۔ دربار لاہور ۔ فوج خالصہ ۔ خاندان شاہی اور امرائے
کے حیرت انگیز حالات ۔ باغات لاہور کی پر فضا کیفیت جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں یا اس
بعد مہاراجہ کھڑک سنگھ مہاراجہ شیر سنگھ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے زمانہ میں ۱۸۴۹ء تک لاہور میں بنا
قیمت عہ ۔ حصہ پنجم لاہور جدید جس میں عہد سلطنت انگلشیہ میں لاہور کو جو علمی و تمدنی ترقی اور
فارغ البالی و وسعت نصیب ہوئی ہے ۔ اس کا مفصل ذکر ہے ۔ قیمت ۸ / کل قیمت